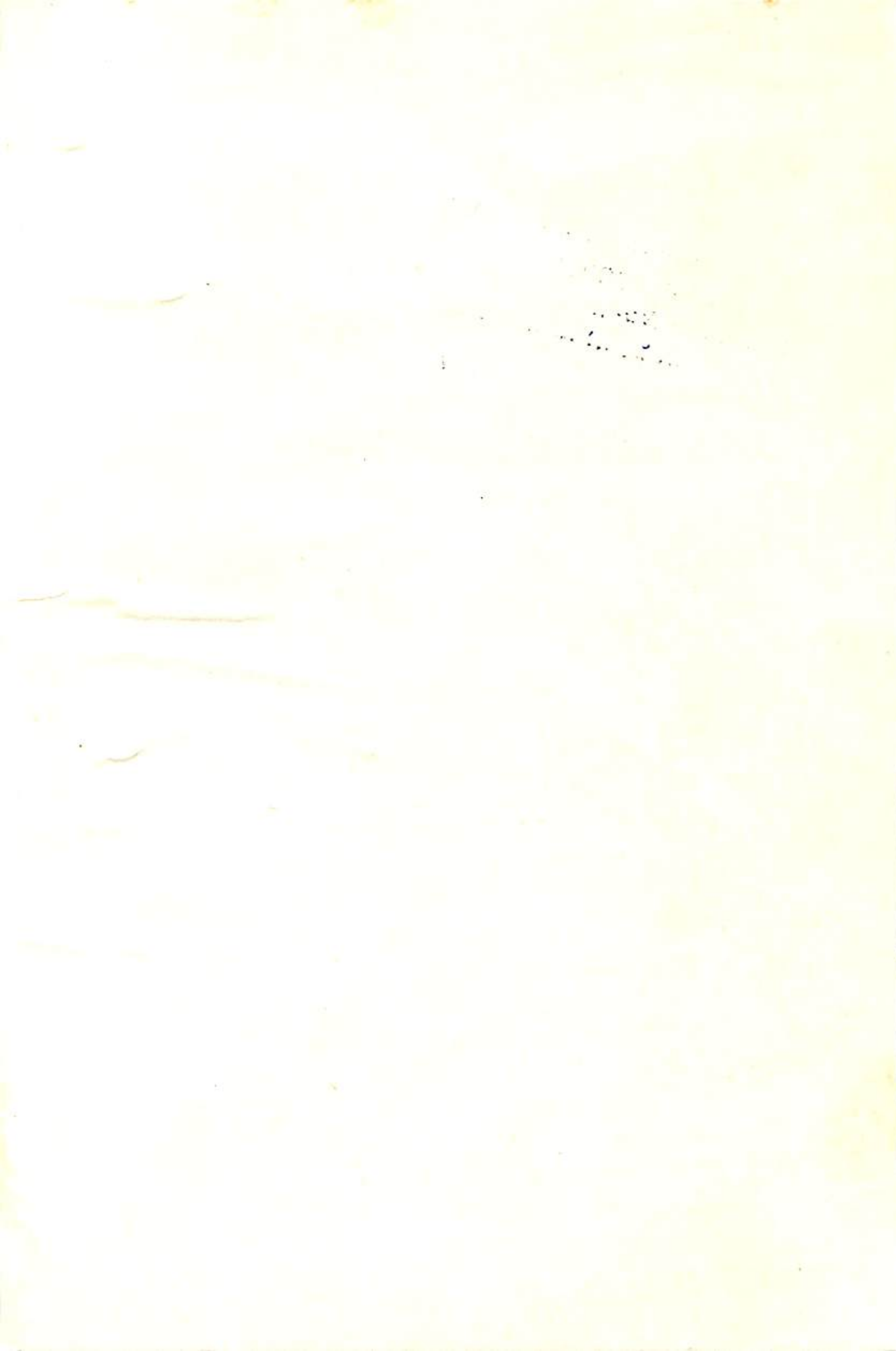

پنجابی ڈرامے



پنجابی ڈرامے

ہندوستانی کتابوں کا سلسلہ

پنجابی ڈرامے

مصنّفین

کرتار سنگھ دگّل
سنت سنگھ سیکھوں
بلونت گارگی

مترجم

مخمور جالندھری



نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا
نئی دلّی

1976 (1898)

قیمت : -/12

PUNJABI FULL-LENGTH PLAYS (Urdu)

تقسیم کار :

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

جامعہ نگر نئی دہلی 110025 ، اردو بازار دہلی 110006
پرنسس بلڈنگ بمبئی 400003 ، یونیورسٹی مارکیٹ علی گڑھ 202001

ڈائرکٹر نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا A/5 گرین پارک نئی دہلی 110016 نے لبرٹی آرٹ پریس
(پروپرائٹرز، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) دریا گنج دہلی 110002 سے چھپوا کر شایع کیا۔

تعارف

پنجابی ناٹک کی تاریخ زیادہ طویل نہیں لیکن خاصی دلچسپ ہے۔ پنجابی میں سب سے پہلا ناٹک بھائی ویر سنگھ نے لکھا۔ ناٹک کا نام تھا راجہ سکھ داتا سنگھ۔ نہ تو بھائی ویر سنگھ کا اپنا رجحان ناٹک کی طرف تھا نہ اُس زمانے کا سماجی ماحول ناٹک کے لیے موزوں تھا۔ لہٰذا اس تخلیق کی ہیئت نہ تو خالص ڈرامائی تھی اور نہ اداکاری کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسے قلمبند کیا گیا تھا۔ بھائی ویر سنگھ نے محض ایک ادبی تخلیق کا پہلا نمونہ پیش کیا جس میں ڈرامائی فن کے محاسن تھے۔ ادب میں اگرچہ اس وقت ڈرامہ کا کوئی مقام نہیں تھا لیکن ڈرامے کھیلے ضرور جاتے تھے۔ پنجاب میں لوگ "راس" اور "لیلا" سے واقف تھے۔ بھانڈ اور نقال بھی اپنی مختصر تخلیقات سے لوگوں کی تفریح کا سامان فراہم کرتے تھے۔ بعد میں پارسی تھیٹر کمپنیوں سے متاثر ہو کر پنجابی ادیبوں نے بھی ڈرامہ لکھنے کی طرف رجوع کیا۔ اس میدان میں لاہور کے رہنے والے آغا حشر کشمیری کا نام ممتاز حیثیت رکھتا ہے لیکن انھوں نے ڈراموں کی تصنیف کے لیے اردو کو ہی ذریعۂ اظہار بنایا۔ پنجابی میں ان کے اسلوب پر کچھ ناٹک لکھے گئے جن میں کرپا ساگر (1879ء) کا ڈرامہ "راجہ رنجیت سنگھ" جو دو حصوں میں تھا (1923ء، 1928ء) اور برج لال شاستری (1894ء) کا لکھا ہوا "پورن ناٹک" (1920ء) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

پنجابی میں ناٹک اور اسٹیج کی باقاعدہ روایت آئی۔ سی۔ نندہ نے شروع کی جنھیں ایک انگریز خاتون نورا رچرڈز کی طرف سے تحریک ملی تھی۔ کالجوں کے طالب علم انگریزی ڈرامہ کھیل کر اپنے ڈرامائی ذوق کی تسکین کیا کرتے تھے۔ نورا رچرڈز اس قسم کی ناپختہ پیشکش کے نقائص سے آگاہ تھی۔ اس سے نہ تو اصل ڈرامہ کی معنویت سے انصاف ہوتا تھا اور نہ ناٹک کھیلنے والوں کی ذہانت اور اختراع کو فروغ پانے کا موقع ملتا تھا۔ نورا رچرڈز نے مشورہ دیا کہ ڈرامہ کھیلنے والے اپنی زبان میں اپنی زندگی کے مسائل پر ڈرامہ لکھیں اور کھیلیں۔ آئی۔ سی۔ نندہ نے اسی مشورہ پر عمل کرتے ہوئے "سبھدرا"

اور "ورگھر" نام کے دو ممتاز ترین ناٹک لکھے۔ ان ڈراموں کو اسٹیج پر بھی انھوں نے ہی پیش کیا۔ آئی سی نندہ انگریزی ڈرامہ کا طالب علم تھا مگر ٹھیٹ پنجابی زبان پر بھی اسے بے پناہ دسترس حاصل تھی۔ اداکاری کا فن اسے قدرت سے ملا تھا، چھوٹا موٹا اسٹیج بنا کر اور اداکاری کے شیدائی ہم عمروں کی ٹولی بنا کر اس نے کئی جگہ اپنے ناٹک کھیلے اور اس طرح پنجابی ناٹک اور اسٹیج کے پاؤں اپنی ہی زمین پر جمتے ہوئے نظر آنے لگے۔ یہ ناٹک راس لیلا سے بالکل مختلف تھا۔ اس کے مسائل اس زمانہ کے مسائل بھی تھے اور سیکولر بھی۔ اس کی ہیئت میں شاعری کا کوئی وجود نہیں تھا۔ اسے پیش کرنے میں راس لیلا اور پارسی تھیٹر کمپنیوں جیسا تصنع بھی نہیں تھا۔ یہ پنجابی ناٹک کا نقطۂ آغاز تھا اور اور ترقی کی منزل تک پہنچنے کے لیے ابھی طویل مسافت کی ضرورت تھی۔

اس کے بعد پنجابی ناٹک کو اپنا میدان وسیع کرنے کے لیے دو طرف سے تحریک ملی۔ یونیورسٹی نے اپنے نصاب میں ناٹکوں کو شامل کر لیا۔ ریڈیائی نشریات میں بھی ڈراموں کو جگہ ملنی شروع ہو گئی۔ ہرچرن سنگھ اور سنت سنگھ سیکھوں کے ناٹک لگاتار کئی برس تک درسی کتابوں کے لیے منظور کیے جاتے رہے۔ اتنی سی تحریک بھی پنجابی ناٹک کی روایت کے مسلسل ارتقار کے لیے ہمت افزا ثابت ہوئی۔ سکولوں اور کالجوں میں بھی شوقیہ ناٹکوں کا رواج زور پکڑ گیا۔ اپٹا کی کوششوں کے باعث ڈراموں کے شائقین کے وسیع تر حلقوں میں ناٹک کھیلے جانے لگے۔ بلونت گارگی، کرتار سنگھ دگل اور سنت سنگھ سیکھوں کو اسی ماحول میں نشو ونما پانے کا موقع ملا۔

اب پنجابی ناٹک اپنے قارئین اور ناظرین کے ساتھ جاندار اور توانا تعلقات قائم کر چکے تھے۔ ناٹکوں اور ناظرین کے درمیان زندہ و تابندہ ناطہ جوڑنے میں عظیم دین گورشرن سنگھ (امرتسر) اور پریم جالندھری (دلی) کی ہے۔ پنجاب کی دو یونیورسٹیوں میں ڈرامے کی باقاعدہ تعلیم دی جاتی ہے۔ اس فن کے ہر پہلو کا علم طلبا تک پہنچایا جا رہا ہے۔ علم و فن اور اسلوب و پیشکش کے دونوں نقطہ ہائے نظر سے پنجابی ناٹک ارتقار کی شاہراہ پر گامزن نظر آ رہا ہے۔ اس دوران میں پریم جالندھری کے علاوہ کپور سنگھ گھمن، گورچرن سنگھ جسوجہ وغیرہ نے بلند معیار کے ناٹک بھی لکھے ہیں۔

اس مجموعے میں تین ممتاز ترین ڈرامہ نویسوں کی تخلیقات شامل کی گئی ہیں۔ اُمید ہے کہ ان سے پنجابی ناٹک کے ارتقار کی رفتار اور حسن کا کچھ اندازہ لگایا جا سکے گا۔

لوہار (1944ء) پنجابی زبان کا پہلا منجھا ہوا ناٹک ہے۔ پختگی کی اصل پہچان یہ ہے کہ وہ زندگی کے دو مخالف پہلوؤں میں امتیاز کر سکتی ہے۔ اور عینیت پسندی سے گزر کر تخیلی دنیا میں

قدم رکھنے کے قابل ہوتی ہے۔ خاندان اور محبّت کا باہمی تناؤ اس ناٹک کا مرکزی موضوع ہے۔
یہ ناٹک 1944ء میں لکھا گیا۔ اس زمانہ کے لوہاروں نے اس ناٹک کے خلاف اپنے غم و غصّہ کا اظہار کیا۔ انھیں یوں محسوس ہوا جیسے لوہاروں کی زندگی کا تمسخر اڑایا گیا ہو۔ لیکن بلونت گارگی تو "لوہار" کے ذریعہ خاندان اور پیشہ کے سنگدلانہ ڈھرّے کو نمایاں کر رہا تھا۔ تمام ناٹک میں لوہار کی بھٹّی دہکتی رہتی ہے۔ ایک طرف عاشق اس بھٹّی میں سے لپکتا ہوا انگارہ لینے کے لیے چکّر کاٹتا ہے۔ دوسری طرف شوہر اس بھٹّی کے گرد اپنے کام میں مصروف رہتا ہے۔ یہ محبّت کے بھڑکنے کی علامت بھی ہے اور خاندان کی کڑی محنت کی علامت بھی ہے۔ بظاہر یہ ناٹک لوہار کی زندگی کی حقیقت پیش کرتا ہے لیکن اگر ذرا غور سے دیکھا جائے تو ایک خاندان کی زندگی کی اشاراتی تصویر بن جاتا ہے۔ عینیت پسندی سے تخیل کی طرف شعوری یا غیر شعوری سفر بلونت گارگی کا عظیم کارنامہ ہے۔

ناٹک "**لوہار**" کے پہلے ایکٹ کا پہلا ہی جملہ ہے — "دودھ کا برتن اٹھا کر کہاں چلی ہو" یہ ناٹک "کہاں چلی ہو —" کا جواب ہے۔ ابتدائی صفحات سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک بھرا پرا خاندان ہے۔ دو بچے ہیں۔ گائے ہے۔ لوہار کا اچھا چلتا ہوا روزگار ہے۔ لوہار کی بیوی سنتی نے اپنی چڑھتی جوانی میں عشق کیا تھا لیکن اب وہ خاندان میں رچی بسی ہے۔ اس کا عاشق (گجن) کہتا ہے — "مجھے صرف ایک ہی انگارہ چاہیے"۔ لیکن "سنتی" کا جواب یہ ہے — "ٹھہری اور جمی ہوئی آگ نہ چھیڑ —" سنتی کی بیٹی بینو بھی آگ ہے۔ اور وہ بھی ٹھہری اور جمی ہوئی نہیں ہے۔ خاندان نے اس کی سگائی کر دی ہے۔ اس دہکتی ہوئی آگ کو ٹھہری ہوئی آگ بنانے کی کوشش کی جارہی ہے — "بینو" صوبیدار کے بیٹے سردن سے پیار کرتی ہے۔ تمام ناٹک میں بینو اور سردن یا سنتی اور گجن کی ہمت کے سامنے ذات پات یا اونچ نیچ کا کوئی ذکر نہیں۔ بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ عورت خاندان کی وفادار ہے یا محبّت کی — ناٹک کے آغاز میں پتہ چل جاتا ہے کہ خاندان اور محبّت کے درمیان تصادم لازمی ہے۔ "دن کو جاتی ہوں تو تم غصّے ہوتی ہو۔ میں بے وقت کیوں بھٹکتی پھرتی ہوں۔ کہتی ہو کہ لوگ باتیں بناتے ہیں؟ خاندان کے سربراہ کو بیٹی پر ہی نہیں بلکہ بیٹی کی ماں پر بھی شک ہے اور شک بے بنیاد بھی نہیں۔ خاندان کے بندھن کو تسلیم کرنے سے پہلے اور اس کے بعد بھی انسان میں اپنی انفرادیت زندہ ہوتی ہے جو خاندان کا جزو نہیں بن سکتی۔ اس انفرادیت کو خاندان میں سمو دینے کے لیے قسمیں کھانی پڑتی ہیں۔ بیٹی گائے کی دم پکڑ کر قسم کھاتی ہے اور اپنی پاکیزگی کا ثبوت مہیا کرتی ہے۔ ماں کو بھی اپنے کیے کا حساب دے کر اپنی وفا کا ثبوت پیش کرنا پڑتا ہے۔

پنجابی ڈرامے

"سردیوں میں تیری بھٹّی کے پاس بیٹھی ہوئی کیا میں تیری بنڈیاں نہیں سیتی رہی۔ تیرے پھٹے ہوئے تہمد کاٹ کر دیبے کی قمیص نہیں بناتی رہی۔ آپ روئی دھن کر رضائیاں نہیں بناتی رہی۔ میں کام سے نہیں اُوبی۔ بلکہ کام نے تو میرے بکھرے ہوئے ہوش وحواس کو یکجا کر دیا ہے۔ میں نے تجھے خوش رکھنے اور گھر کو سنبھالنے کے تمام جتن کیے۔ میں نے تیرے بیٹے کو جنم دیا، بیٹی کو جنم دیا لیکن تو نے ہمیشہ اپنے دل میں کینہ رکھا۔ دل میں شک کی پرورش کی۔ مجھے ایک دن کے لیے بھی کہیں جانے نہ دیا۔ بس مجھے بھٹّی سے باندھ کر رکھا۔ میں نے ایک بار اپنا میکہ چھوڑا تو دوبارہ وہاں جا نہ سکی۔"

پہلے ایکٹ میں ہی بھٹّی مرکزی علامت بن جاتی ہے۔ کوئی بھٹّی میں سے دہکتا ہوا انگارہ ڈھونڈتا ہے، کوئی بھٹّی کی ٹھہری اور جمی ہوئی آگ کو نہ چھیڑنے پر زور دیتا ہے، کوئی بھٹّی میں روشن اور لپکتے ہوئے کوئلوں کی بات کرتا ہے۔ آخر میں بھٹّی سنگدل خاندانی نظام کی علامت بن جاتی ہے۔ سنتی کہتی ہے۔

"میرے باپ نے تجھ سے میری شادی کر کے اپنی ضد پوری کی۔ اُس روایت کی پرورش کی۔ لوہار کی تپتی جلتی ہوئی کسک کی۔ بھٹّی کا شراپ۔ میں ایک بھٹّی سے دوسری بھٹّی کی راکھ کریدنے کے لیے یہاں آگئی۔"

دوسرے ایکٹ میں گارگی آگ اور دل کی تڑپ کو ایک جیسے الفاظ کی طرح استعمال کرتا ہے۔ "یہاں کی ہر عورت کے دل میں ایک کسک سلگتی ہے اور اس کی آگ میں بھڑک کر وہ راکھ ہوئی پڑی ہے۔" بنیادی مسئلہ یہ ہے — یہ تڑپ اختیاری ہے یا بے اختیاری — ! اسے روکا جا سکتا ہے یا یہ پھوٹ کر باہر آجائے گی۔ ! اس تڑپ کو قابو میں رکھنے کا ذکر رسّے کی علامت کے ذریعہ بھی ہوا ہے۔

سنتی : یہ کیا لیے پھرتی ہو—

بینو : کل گائے نے بندھن توڑ دیا تھا۔ اسی کو جوڑ رہی تھی۔

سنتی : دیکھوں تو......

بینو : یہ رسّے بکڑے— گھس کر کمزور ہو گیا ہے— میں نے اسے گانٹھ تو دیا ہے مگر یہ دو دن بھی نہیں چلے گا۔

بالآخر یہ بھڑکتی ہوئی کسک بے اختیاری ہو جاتی ہے — گائے کو قابو میں رکھنے والا بندھن آخر ٹوٹ گیا اور بینو اپنے عاشق کے ساتھ فرار ہو گئی۔ ناٹک کا ابتدائی جملہ — "دودھ کا برتن اٹھا کر

کہاں چل دی؟" کا مطلب یہاں آ کر نمایاں ہوتا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ "دودھ کا برتن اٹھا کر بینو گائے دوہنے ہی جا سکتی ہے۔" لیکن اپنی تڑپ کو اپنائے رکھنے والی ماں جانتی ہے کہ یہ تڑپ بے اختیاری بھی ہو سکتی ہے۔ دودھ کا برتن اٹھا کر بینو گائے کے علاوہ کسی دوسری سمت میں بھی جا سکتی ہے — "دودھ کا برتن گائے کے پیروں میں لڑھک رہا تھا۔" "بچھڑا سارا دودھ پی گیا۔" وہ چلی گئی — "عشق نے اپنا مسئلہ حل کر لیا لیکن خاندان کے لیے مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"کاکو کی بیٹی بھاگ گئی! صوبیدار کے سرون کے ساتھ! پکڑ لاؤ اس بے حیا کو! والدین کے سر میں خاک ڈال گئی! اس حرامی کے ٹکڑے کر دو۔ اس شیطان کی ٹانگیں توڑ دو۔"

ڈراما تو یہاں بھی ختم ہو سکتا ہے لیکن یہاں ختم ہو کر یہ عنیمت پسندی رہ جائے گا — اس ڈرامہ کا مرکزی خیال والدین اور اولاد کے درمیان ضابطہ اور آزادی کے تصادم کا آئینہ دار نہیں۔ یہ ڈرامہ کسی اور ہی بنیادی تصادم سے نبٹنے کی کوشش ہے۔ بینو تو شادی سے پہلے اپنی محبت کی رہگذر پر چل پڑی۔ اس نے اپنے خاندان کا کہا نہ مانا۔ لیکن جو لڑکی اپنے میکے اور اپنے پریوار کا کہا مان کر اپنی مرضی کے خلاف شادی کرا لیتی ہے وہ بیٹھے بیٹی کی ماں بن کر خاندان کے تمام فرائض انجام دیتی ہوئی اپنی بھڑکتی آگ کو دبا لیتی ہے۔ اس کے مسئلہ کی بھرپور تڑپ اور کسک میں عکاسی ابھی باقی ہے۔

ڈرامہ نگار گارگی اپنے ناٹک کے بارے میں کہتا ہے "نئی پود کے دل میں پرانی پود کے خلاف بغاوت کا جذبہ ہے۔ نئی بیداری پرانی بیداری کی کینچل اتار کر آگے بڑھتی ہے لیکن میں نے اس ناٹک میں نفسیاتی بغاوت کی چنگاری ماں کی طرف سے بیٹی کی جانب نہیں بلکہ بیٹی کی طرف سے ماں کی جانب پھینکی ہے —" اپنی تخلیق کے بارے میں تنقیدی فیصلہ صادر کرنا خاصا خطرناک ہے۔ ڈرامہ نویس گارگی کا اپنی تخلیق کے بارے میں یہ بیان صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ یہ ناٹک نئی نسل یا پرانی نسل، نئی بیداری یا پرانی بیداری کو پیش ہی نہیں کرتا۔ اگر بینو کا بھاگ جانا پرانی پود کے خلاف نئی پود کی بغاوت ہے تو سنتی کا بھاگ جانا اسی پود کے خلاف اسی پود کی بغاوت ہے۔ یہ بغاوت نئی پود کی پرانی پود کے خلاف تو ہو نہیں سکتی۔ پھر کیا یہ نئی پود کے خلاف پرانی پود کی بغاوت ہے — ناٹک کی تشکیل اس طرف کوئی اشارہ نہیں کرتی۔ بینو کا بھاگ جانا بھی نئی بیداری کا ثبوت نہیں۔ سرون کے ساتھ بینو کا عشق سنتی اور گجن کے عشق کی تجدید ہے۔ بھاگ جانے کا فیصلہ تو سنتی ہی نے کیا تھا لیکن وہ خوف زدہ ہو گئی۔ اس فیصلہ کو پائے تکمیل تک پہنچانے میں تاخیر ہو گئی۔ یہ بغاوت نئی پود کی پرانی پود کے خلاف نہیں بلکہ خاندان کے خلاف محبت کی بغاوت ہے۔ بینو میکہ اور خاندان چھوڑ گئی۔

سنتی صرف اپنا خاندان چھوڑ گئی ۔ اپنا خاندان ہی نہیں بلکہ اپنا بیٹا بھی ۔تہمد کاٹ کر بنائی ہوئی قمیص، خود روئی دھنک کر بنائی ہوئی رضائیاں ۔۔ سب کچھ چھوڑ گئی ۔ اصل بغاوت یہی ہے ۔چڑھتی جوانی میں نوعمر لڑکے کے ساتھ فرار ہونے کے افسانے صدیوں کی روایت پر مبنی ہوتے ہیں ۔ درمیانی عمر میں بھرے پُرے گھر کو چھوڑ کر درمیانی عمر کے عاشق کے ساتھ بھاگنے کی کہانی کے لیے اس سے زیادہ گہری بنیاد کی ضرورت ہے ۔" میں نے اس ناٹک میں نفسیاتی بغاوت کی چنگاری ماں کی طرف سے بیٹی کی جانب نہیں بلکہ بیٹی کی طرف سے ماں کی جانب پھینکی ہے ۔۔" یہ بات بھی زیادہ معقول نہیں معلوم ہوتی ۔ کیا بیٹی کی بغاوت کے لیے عام سر چشمہ ماں ہے ؟ کیا بیٹی اپنی ماں کو اس بغاوت کی تحریک دے کر گئی ہے ؟ بیٹی کے بھاگنے سے پہلے ماں کے دل میں کوئی تڑپ نہیں تھی ۔ دہکتی ہوئی آگ، ٹھہری ہوئی آگ اور راکھ میں بجھتے ہوئے کوئلوں کی بات تو اس سے بہت پہلے شروع ہو چکی تھی ۔ بنیو کے فرار ہونے سے یہ آگ اور بھی بھڑک اٹھی ۔ بس!

اس ناٹک کی ہیروئن سنتی ہے بنیو نہیں ۔ سنتی کا گجن بھی اس ناٹک میں سب جگہ موجود ہے ۔ سرون صرف اپنے ذکر کے سوا کچھ بھی نہیں ۔ ناٹک میں جتنی بھی شعریت ہے وہ سنتی سے وابستہ ہے ۔ اسی کے عشق کو گہرائی سے پیش کیا گیا ہے ۔ اس کے دل میں" اچانک آج دھوپ کی لہک اور پانیوں کی دھڑکن جاگ اٹھتی ہے ۔" رات کو میرے یعنی سنتی کے دل میں پیپل کے تنوں کے ٹوٹنے کی آواز آتی ہے اور میرے پہلو میں سورج تپنے لگتے ہیں کئی بار بھٹّی کی راکھ نکالتے ہوئے میں اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھتی ہوں ۔ پھر تیرا (گجن کو) خیال آتا ہے اور میرے ہاتھ ندی کے پانی سے دھل جاتے ہیں اور میرے ہاتھوں میں روشنی جھلملانے لگتی ہے ۔" اس ناٹک کے آخری ایکٹ کو ایک رزمیہ ہونا ہی تھا ۔ یہ ناٹک سماجی مسئلہ سے نہیں بلکہ انسانی کردار سے وابستہ ہے ۔ بنیادی فطرت سے وابستہ ہونے کی وجہ سے ہر ایک رزمیہ تمثیل کی تکنیک میں ہی لکھا جا سکتا تھا ۔ کاکو اور سنتی بھی ہمیشہ لوہار اور لوہار کی بیوی کی طرح باتیں نہیں کرتے ۔ وہ حقیقی انسانیت کی علامتیں بن جاتے ہیں ۔ ان کی بولی ٹھولی ان کی ذات سے آگے نکل جاتی ہے ۔

محبّت کو اگرچہ اپنی مرضی کی آزادی مل گئی ۔ خاندان توڑا گیا مگر ٹوٹا نہیں ۔ خاندان کا سربراہ اپنی بھٹّی کے آگے اپنے اڈے پر بیٹھا ہے ۔ اس کی نسل کا نمائندہ دیپا اس کے پاس ہے ۔ اس نے اپنا آبائی پیشہ اختیار کر لیا ہے ۔۔" جب میں بڑا ہو جاؤں گا تو بڑے بڑے گڑسے بنایا کروں گا ۔" ناٹک کے آخر میں ۔" دیپا دھونکنی چلاتا ہے اور کاکو منہ اندھیرے لوہا کوٹتا ہے ۔" محبت آزادی

کی راہ پر گامزن ہوگئی لیکن خاندان اپنی جگہ پر جما ہوا ہے۔ سنتی اور سنیو کو اس کی ضرورت نہیں تھی مگر دیپے کو ہے "دیپے۔ میرے پاس بیٹھ ـــ" یہ اس ناٹک کے آخری الفاظ ہیں۔ اب کا کو دیپے کا باپ بھی ہے اور ماں بھی۔ پیار اور خاندان دونوں نے اپنی روایت اُجاگر کر دی۔

ناٹک **پرانی بوتلیں** (1954ء) محبت اور خاندان کے صدیوں پرانے مسئلہ کے گرد گھومتا ہے۔ عورت اور مرد بار بار خاندان کی پرانی بوتل میں پیار کی نئی شراب ڈالتے ہیں اور اسے پھر سے الٹ کر اُسی پرانی شراب سے بھر لیتے ہیں۔ خاندان صرف بوتل نہیں کہ اسے اپنی پسندیدہ شراب سے بدل لیا جائے۔ خاندان صرف روپ نہیں، اس کا اپنا ایک کردار ہے۔ اور نیا کردار اس روپ میں سماتا نہیں۔ جب بھی اُسے ایک نئے کردار سے بھرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو روپ خود بخود مسخ ہونے لگتا ہے۔ شیکھر اور دیپتی کا رچا بسا گھر ہے، بچہ ہے، آرام و آسائش کے تمام سامان میسر ہیں لیکن میاں بیوی دونوں ہی خاندان سے باہر کسی دوسرے شخص پر مائل ہیں۔ دیپتی پریم پر اور شیکھر حُسنہ پر مائل ہے۔ گھر کا تمام ضابطہ درہم برہم ہے۔ ان کا نوکر اور نوکرانی بھی گھر کی حدود پار کر کے کسی اور طرف جھک جاتے ہیں۔ ہر جگہ روپ بدشکل ہوا پڑا ہے۔ معصوم بچے بھی اس بے اطمینانی کی زد میں ہیں۔ وہ بڑوں کی محبت پر تمسخر انگیز نکتہ چینی کرنے کے قابل ہو گئے ہیں۔ بنیادی سوال پرانے روپ اور نئے کردار کے باہمی رشتے کا ہے۔ خاندانی روپ اپنا لینے پر بھی خاندان کے باہر کسی آدمی کی طرف مائل ہو جانے سے سب کچھ اُتھل پتھل دکھائی دیتا ہے۔

گارگی نے خاندان اور پیار کے جس مسئلہ کو چھیڑا تھا دگل نے اُسے وسعت دی ہے۔ گارگی نے بیٹی کی جانب سے باپ کی طرف بغاوت کا اظہار نہیں کیا تھا ـــ بیوی اور ماں کی بغاوت شوہر اور باپ کی طرف دکھائی تھی۔ لیکن اس میں بھی ایک روایتی عنصر تھا۔ ماں اور بیٹی دونوں کے عاشق شادی سے پہلے کے ہیں۔ دگل پیار کی اس روایت کے پار جھانکتا ہے۔ عاشق کا فیصلہ شادی کے بعد بھی ہوتا ہے۔ شادی سے پہلے بھی عاشق اور معشوق میں سے ایک کنوارا ہے اور ایک شادی شدہ۔ ایک جگہ محبت شادی شدہ مرد اور بیوہ کے درمیان بھی ہے۔ پیار کا رشتہ شادی سے پہلے کے وقت سے توڑ کر دگل نے اس کا غیر روایتی، آزاد اور بھیانک روپ پیش کر دیا ہے۔ پیار کسی بھی حالت میں ممکن ہے۔

دگل نے اس کا مکالماتی روپ بدلا ہے۔ مکالموں کو شعروں کی طرح لکھا ہے۔ مکالمے کو

شعر کی طرح پڑھنے سے وہ شعر نہیں بن جاتا لیکن زندگی کے تذکرے میں چھپے ہوئے شعریت آمیز معانی کا اشارہ ضرور مل جاتا ہے۔ اس ناٹک کا طرزِ تحریر ہی اس کی مرکزی علامت ہے۔ دگل نے خاندانی بے اطمینانی کو حقیقت کی بنیاد پر نہیں بلکہ شعریت کی بنیاد پر پیش کیا ہے۔ اس ناٹک کے آغاز ہی میں خاندان کی شعریت بچہ چیتن پیش کیا گیا ہے۔ خاندان کے دو اہم افراد کا یعنی ماں باپ کا اس بچّے کے تئیں رویّہ بے کیف مکالمے جیسا ہے۔ وہ ماں باپ ہونے کے باوجود کسی دوسرے کے عاشق اور معشوق بنے ہوئے ہیں۔ چیتن کی معصومیت ماں باپ کا تمسخر اُڑاتی ہے۔ نوکر اور آیا کی محبّت بھری گفتگو بھی بچوں کی وجہ سے کسی مسخرے کی بات چیت معلوم ہوتی ہے۔ عشق میں اندھے میاں بیوی اپنے محبوب اور محبوبہ سے ملنے کے لیے ایک مشترکہ دوست کے گھر پہنچتے ہیں اور وہاں پہنچنے سے پہلے تمسخر کا موضوع بن جاتے ہیں۔ خاندان کے تمام قواعد وضوابط تہ وبالا ہیں۔ خاندان کی خوبصورتی بدصورتی بنی ہوئی ہے۔ خاندان کا روپ اور ہے کردار اور ہے۔ اس لیے خاندان میں ایک افراتفری مچی ہوئی ہے۔ سچّا پیار بھی تمسخر انگیز بنا ہوا ہے۔ خوبصورت بچّے کے والدین کسی بحث میں الجھ جاتے ہیں چینی کے برتن توڑ کر اپنی شکستہ انفرادیت کی گواہی دیتے ہیں۔ خاندان کے باہر عشق میں مبتلا ماں باپ کا الجھاؤ یہ ہے کہ وہ چائے پینے والے پیالہ کو بحث کا موضوع بنا لیتے ہیں۔ پہلے ایکٹ کا مرکزی خیال ہے افراتفری اور اس کا نتیجہ ہے تمسخر۔ اور اس کی مرکزی علامت ہے — ٹوٹتے ہوئے چینی کے برتن۔

دوسرے ایکٹ میں شاعری اپنے ہی طریقہ سے احتجاج کرتی ہے۔ مکالمے اپنے ڈھنگ سے سمجھوتہ کی راہ اپناتے ہیں۔ بچّہ بیمار ہو جاتا ہے۔ والدین عشق تو برقرار رکھتے ہیں لیکن بچّے کی دیکھ ریکھ کے لیے ڈیوٹی تقسیم کر لیتے ہیں۔ ابھی تک ان کا رجحان بکھرا ہوا ہے۔ وہ بچے اور اپنے عاشق و معشوق کو اپنے سے وابستہ رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ ایک بوتل میں نئی اور پُرانی شراب دونوں کو محفوظ رکھنے کی کوشش ہے۔ بچّے کا پروٹسٹ انسانی پروٹسٹ ہے اور والدین کا سمجھوتہ میکانکی ہے۔

بچہ بخار کی شدّت میں بڑبڑانے لگتا ہے — "میری ممی کہاں ہے۔ میری ممی کہاں ہے —" لیکن مینتی ابھی مکمل ماں نہیں بنی۔ وہ ماں اور محبوبہ کے درمیان کوئی شکستہ چیز ہے۔ گھر میں سکون ہے مگر خاندان میں ایکتا نہیں ہے۔ بچّہ ماں باپ کو متحد نہیں کر سکا۔ دونوں میں صرف سمجھوتہ کرا سکا ہے۔ شعریت کا جواب میکانکی انداز سے دیا جا رہا ہے۔

مینتی : اس سمجھوتہ کا فائدہ یہ ہوا ہے۔

کہ اس گھر میں اب برتن ٹوٹنے بند ہو گئے ہیں۔
آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کوئی کسی کی طرف نہیں دیکھتا۔
کرید کرید کر کوئی کسی کے دل میں داخل ہونے کی کوشش نہیں کرتا۔
اس گھر میں کسی نے اونچی آواز نہیں سنی۔
پریم: ایک خاموشی قبرستان کی خاموشی ہوتی ہے۔

شاعری اس "قبرستان کی خاموشی" کو جیتے جاگتے گھر کی چہل پہل میں بدلنے کے لیے مزید زور لگا دیتی ہے۔ بچے کا بخار اور بھی تیز ہو جاتا ہے۔ ماں باپ بخار کی زبان سننے کے لیے مجبور ہو جاتے ہیں۔ پہلی بار شیکھر باپ کی طرح پریشان ہے اور دمینتی ماں کی طرح پریشان ہے۔ سراسر ممتا بھی ہوئی ہے۔ بچے کے سرہانے ڈیوٹی دیتے ہوئے شیکھر ایک کے بعد دوسرے ڈاکٹر کو بلاتا ہے۔ ماں اپنے بچے سے دور ہوٹل میں بیٹھ کر اچانک مضطرب ہو جاتی ہے۔

دمینتی: میں ہوٹل میں بیٹھی چائے پی رہی تھی
ایک دم جیسے میرا کسی نے کلیجہ پکڑ لیا
میں چائے ویسی کی ویسی چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

رامو: یہ ماں کا دل ہوتا ہے بی بی جی۔

دونوں ہی بچے کے سرہانے ایک ہی مقصد لیے ہوئے آ بیٹھتے ہیں۔ ایک لمحے کے لیے دونوں اپنے محبوب اور محبوبہ کو بھول جاتے ہیں۔ دونوں اپنے بچے کی خیر و عافیت کے لیے دعا مانگتے ہیں۔ یہ بات "سمجھوتے" سے کچھ زیادہ عظیم ہے۔ دمینتی اپنے بچے کے دکھ سے رنجیدہ اپنے عاشق کا آیا ہوا فون نہیں سنتی لیکن اس کے متعلق کوئی نیا فیصلہ بھی نہیں کرتی۔ دوسرے ایکٹ کا مرکزی خیال ہے "میکانکی سمجھوتہ"۔ اس کے نتیجہ میں کچھ المیہ بھی ہے۔ اور اس کی مرکزی علامت ہے بچے کا بخار اور عاشق کا ٹیلیفون جسے سنا نہیں جاتا مگر فون بند بھی نہیں کیا جاتا۔

اگر یہ ناٹک یہیں ختم ہو جاتا تو "میلو ڈرامہ" ہی بن جاتا۔ بچے کے بخار نے مسئلے کو چھپا کر رکھ دیا۔ یہ آسان ساحل دگل کو منظور نہیں تھا۔ شکستہ شکستہ، بکھرا بکھرا الجھاؤ بھی ہم نے دیکھ لیا۔ پھٹا اور سلا ہوا سمجھوتہ بھی۔ لیکن خاندانی ثبوت تو ایک زندہ جاوید حقیقت ہے جو تیسرے ایکٹ میں پیش کی گئی ہے۔

گزشتہ ایکٹ میں شعریت بخار بن کر آئی تھی اور اس بار بارش بن کر آتی ہے۔ بارش نے

شیکھر اور دمینتی کو گھر سے دور رکھا ہے اور ان کے محبوب اور محبوبہ کو آپس میں ملنے کا موقع دیا۔ شیکھر اور دمینتی کی عدم موجودگی میں کوئی ان دونوں کا مخالف نہیں ہے۔ کوئی ایک دوسرے سے اکتایا ہوا نہیں ہے۔ ایک دوسرے سے دور ہونے کی کوئی شعوری اور غیر شعوری حرکت بھی نہیں ہوتی۔ صرف بارش ہوئی ہے جس نے شیکھر اور حُسنہ کو دمینتی اور پریم کو ایک دوسرے سے دور رکھا ہے اور حسنہ اور پریم کو ایک دوسرے کے قریب کر دیا ہے۔ حسنہ اور پریم کے درمیان کوئی جذباتی بات چیت بھی نہیں ہوتی۔ گزرے ہوئے زمانے کے لیے پشیمانی نہیں اور آنے والے زمانے کے لیے کوئی وعدہ نہیں کوشش و کاوش سے جوڑے ہوئے رشتہ کو تیاگ دیا گیا اور خود بخود جڑ کے رشتے کو منظور کر لیا گیا۔

حُسنہ : تمہارا سگریٹ سلگاتے ہوئے پریم نہ مجھے ایڑیاں اٹھانی پڑتی ہیں نہ تمہیں گھٹنوں کے بل جھکنا پڑتا ہے۔

بس یہی زندگی کے قدرتی روپ کی پہچان ہے۔ اس سچائی کو شیکھر اور دمینتی نے نہیں پہچانا — اگر پہچانا ہے تو پریم اور حُسنہ نے — اس سچّائی کو پہچان کر وہ اس خاندان کو چھوڑ گئے اور اس گھر کو شکستہ بھی نہیں کیا۔ ان سب باتوں کا فیصلہ حقیقت کی سطح پر سوچ بچار کے بعد نہیں ہوا بلکہ شعریت کی گہرائی میں اچانک ہوا ہے۔ اس ایکٹ کا مرکزی خیال ہے قدرتی و سالم روپ۔ اس کا مفہوم ہے منضبط عشق اور اس کی مرکزی علامت ہے بارش۔

زندگی کے بے ہنگم تذکرہ میں زندہ جاوید اور معنی خیز شعریت پیدا کرنے والا ایسا ناٹک پنجابی میں کوئی اور نہیں۔

متذکرہ بالا دونوں ڈراموں کے بارے میں ایک مشترکہ بات کہنا جائز ہوگا کہ دونوں ہی ڈرامے پیار کی روایت سے دُور جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ بچّوں کی ماں اپنے عاشق کے ساتھ فرار ہو کر ازمنہ وسطیٰ کے پیار کے تصور کو رد کر گئی۔ بنیو یا دمینتی دونوں میں سے کسی ایک کو بھی اغوا نہیں کیا گیا۔ دونوں اپنی مرضی سے اپنے خاندان کو چھوڑ جاتی ہیں۔ دونوں کے پیار میں ازمنہ وسطیٰ والی ایک جبری پوشیدگی ہے۔ بنیو اور سنتی کے پیار کا دوسروں کو علم ہے۔ لیکن وہ اپنے نمایاں اور ظاہری پیار کو بھی گائے کی قسم کھا کر یا خاندان کے تئیں اپنے فرض کو جتا کر چُھپاتی ہیں۔ دیہاتی ماحول میں ازمنۂ وسطیٰ کا مجبور پیار ہی پیش کیا جا سکتا ہے۔ دگل پیار کو شہری ماحول میں جدید اور آزاد روپ میں پیش کر سکا ہے۔ اگر دوسرے ایکٹ میں اٹک کر ختم کر دیا جاتا تو ممتا پر عشق فتح پاتا۔ بات پھر بھی وہی ازمنۂ وسطیٰ کی معلوم ہوتی۔ دگل پیار اور خاندان کے موضوع کو اس تجزیہ سے چھٹکارا دلا دیتا ہے۔ اس ناٹک میں نہ کوئی چھپاؤ ہے،

نہ کوئی مجبوری اور نہ شادی سے پہلے کیے گئے کسی وعدے کی یاد — خاندانی نظام اس حد تک ٹوٹ چکا ہے کہ نہ کسی الزام کا ڈر ہے نہ بدنامی کا، نہ اپنے پیچھے دوڑنے والے ہجوم کا خطرہ — جو بھی فیصلہ ہوا اس پر کوئی مجبوری عائد نہیں۔ گارگی نے روایت کو توڑنے کی پہلی کوشش کی تھی۔ مگر وہ متوازن نہیں تھی۔ دگل نے اس کوشش کو توازن کی منزل تک پہنچایا۔ خاندان دونوں ناٹکوں میں برقرار رہا۔ لوہار میں خاندان ٹوٹ گیا تھا۔ "پرانی بوتلیں" میں وہ سالم ہے۔ دونوں ناٹکوں نے زندگی کے شعریت آمیز پہلو کی علمبرداری کی ہے۔

دمینتی (1960ء) یہ ناٹک پرانے "رس وادی" اور جدید ڈسکشن پلے، کے اسلوب کا امتزاج ہے۔ رس وادی ناٹک پہلے چار ایکٹوں میں ختم ہو جاتا ہے۔ اس حصے میں شرنگار رس (جمالیاتی) زیادہ نمایاں ہے — پہلا، دوسرا، اور تیسرا ایکٹ خیالی محبت سے تعلق رکھتے ہیں نل اور دمینتی نے ابھی ایک دوسرے کو دیکھا ہی نہیں۔ لیکن وہ دونوں ایک دوسرے کے ہو چکے ہیں اور انھوں نے ایک دوسرے کی خاطر مصائب جھیلنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ پہلا ایکٹ اور دوسرے ایکٹ کا نصف حصہ خالص خیالی محبت کی عکاسی کرتا ہے۔ نہ دمینتی نے نل کو دیکھ رکھا ہے اور نہ نل نے دمینتی کو۔ لیکن خطوں کے ذریعہ، ایک دوسرے کی تصویروں کے ذریعے، قاصدوں کی زبانی ایک دوسرے کے اوصاف کے بیان کے ذریعہ دونوں ایک دوسرے کو پیار کرنے لگتے ہیں۔ دوسرے ایکٹ کے پچھلے نصف اور تیسرے ایکٹ میں نل اور دمینتی اپنے اپنے پیار کے استحکام کا اظہار کرتے ہیں۔ پہلے اندر دیوتا نل کو دمینتی کے ساتھ محبت کرنے سے روکتا ہے۔ پھر اگنی دیوتا، جل دیوتا اور پون دیوتا دمینتی کے سامنے اپنی محبت کا اظہار کرتے ہیں اور اسے نل کے ساتھ شادی کرنے سے روکتے ہیں۔ وہ اپنے غصے کا بھی اظہار کرتے ہیں اور اس محبت کے برے نتائج سے بھی آگاہ کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود نل اور دمینتی اپنے ارادے پر قائم رہتے ہیں حالانکہ انھوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تک نہیں اور دونوں نے ایک دوسرے سے کوئی وعدہ نہیں کر رکھا۔ چوتھے ایکٹ میں سوئمبر کا منظر ہے۔ دیوتا اور نل قماربازی میں ایک دوسرے کو مات دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ جوئے کے دوران دیوتا اور دمینتی اپنے اپنے فریق کی جائز اور ناجائز مدد بھی کرتے ہیں۔ آخر دمینتی نل کے گلے میں ورمالا ڈال دیتی ہے جو صابر اور فیاض ہے۔

پہلا ایکٹ اور دوسرے ایکٹ کا پہلا نصف مکالموں کی خوبی سے تخلیق کیا گیا ہے۔ یہ مکالمے نل اور دمینتی کی ملاقات کی طرف اشارہ کرتے ہیں اس قسم کے مکالمے کا جو مزاج ہے اس میں بہت

کچھ فالتو ہے۔ دوسرے ایکٹ کا پچھلا نصف اور تیسرا ایکٹ خوف، لالچ اور کردار کی مضبوطی کے آئینہ دار ہیں۔ ان ایکٹوں میں سراسر لفاظی ہے اور کردار کے استحکام کا پھیلاؤ ہے۔ ڈرامائی واقعہ کوئی نہیں۔ چوتھے ایکٹ میں بھی پہلے ایکٹ کا واقعہ نمودار ہوتا ہے۔ ایسے ناٹک سے لطف اندوز ہونے کے لیے ایک خاص فنی ادراک کی ضرورت ہے۔ ڈرامہ کی رفتار سست ہے۔ واقعات کے بغیر کردار کی عکاسی اس ڈرامہ کی نمایاں خصوصیت ہے۔

سیکھوں نے نل دمینتی کی پرانی کہانی کو جدید رنگ عطا کرنے کے لیے اس کا اشاراتی تجزیہ کیا ہے۔ سیکھوں صاحب کا کہنا ہے ——"نل انسان ہے اور دمینتی دھرتی۔ دیوتا قدرت کی مختلف طاقتیں ہیں۔" اس بیان کے مطابق ناٹک کا تجزیہ نہیں کیا جا سکتا۔ جب بھی کوئی ادیب تبصرہ نگار بننے کی کوشش کرتا ہے تو اس کا نتیجہ ہمیشہ اچھا نہیں برآمد ہوتا۔ تبصرہ نگار سیکھوں کے بیان کے مطابق ——"دیوتا قدرت کی مختلف طاقتیں ہیں لیکن ان کے ناٹک کے ہیرو اندر دیوتا یہ کہتے ہیں:

اندر : دمینتی کو اتنا شعور نہیں۔ وہ قدرت ہے اور بے شعور ہے۔

راجہ نل : دیوتا قدرت کے آگے بے بس ہیں............

....

ہم دیوتا سے خوشحالی مانگتے ہیں تو قحط پڑ جاتا ہے۔ بارش مانگتے ہیں تو سوکھا پڑ جاتا ہے۔ بیٹا مانگتے ہیں تو بیٹی آجاتی ہے۔ بیٹی مانگتے ہیں تو کچھ بھی نہیں آتا۔ میں سمجھ گیا۔ کہ دیوتا قدرت سے اپنی تمنا پوری نہیں کرا سکتے۔"

خیر۔ اتنا تو ظاہر ہے کہ اس ڈرامے میں انسان اور دیوتا کے روزِ ازل سے چلے آ رہے تعلقات کو جدید نظریہ سے دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ پرانی کہانی میں دیوتا نل سے ناراض تھے کیونکہ وہ دمینتی سے محبت کرتا تھا اور اس طرح دیوتاؤں کی راہ میں حائل تھا۔ زیرِ نظر ڈرامہ میں اس ناراضگی کو انسانی دکھ کا بنیادی سبب مانا گیا ہے۔ نل کی رعایا دیوتاؤں کے ہاتھوں دکھی ہے۔ جنگل میں آگ لگتی ہے، بارش بہت ہوتی ہے۔ تپتی ہوئی دکھنی ہوا چلتی ہے۔ جھکڑ چلتے ہیں۔ پیڑوں، نباتات اور معدنیات پر دیوتاؤں کا عتاب نازل ہے۔ شہر کا بیشتر حصہ سیلاب میں بہہ جاتا ہے۔ لوگ منہدم گھروں میں سے نکل کر بازاروں میں آجاتے ہیں۔ راجہ نل کے پاس اس مصیبت کو ٹالنے کا کوئی سامان نہیں۔ اس ناٹک کے پچھلے دو ایکٹ اس ناگزیر مصیبت سے وابستہ ہیں۔ نل اور دمینتی جانتے ہیں کہ

انسان صرف ایک بات میں دیوتاؤں سے افضل ہے اور وہ ہے محبّت کا پھل یعنی اولاد جو انسان ہی کو میسر آتی ہے دیوتاؤں کو نہیں ۔ دکھ، پریم اور سنتان انسان کے ناگزیر رفیق ہیں ۔ انسان محبّت سے دکھ کا مقابلہ کرتا ہے اور اولاد کے ذریعہ اپنے آپ کو غیر فانی بناتا ہے ۔ یہی اس ناٹک کا مرکزی خیال ہے ۔ دیوتا دمنیتی کو حاصل نہ کر سکے ۔ ان کا عتاب انسان کے لیے وسیع تر مصیبت کی شکل اختیار کر لیتا ہے ۔ انسان کے پاس اس کا مقابلہ کرنے کے لیے صرف ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ ہے محبّت!

سیکھوں کے پاس متشکل پیکر سے کہیں زیادہ بے شکل و صورت عزم کی دولت ہے ۔ پہلے چار ایکٹوں میں انسان کی محبّت اور دیوتاؤں کا عتاب متشکل واقعہ بن کر سامنے آتے ہیں ۔ دیوتا بھی انسانی شکل و صورت اختیار کر کے، ڈرامے کا کردار بن کر ناٹک کے دھارے میں شامل ہوتے ہیں ۔ پچھلے دو ایکٹوں میں دیوتاؤں کی متشکل شخصیت غائب ہو جاتی ہے ۔ آگ، قحط اور سیلاب کو دیوتاؤں کا نازل کردہ عتاب مان کر اُن کا تصوراتی تجزیہ پیش کیا گیا ہے ۔ واقعہ سے تصور کی طرف آگے بڑھنا آہستہ آہستہ جدید تخلیقی کاوش بنتا جا رہا ہے ۔ دکھ کو دکھ پر ختم کر دینا "ایبسرڈ ناٹک" کی خاص پہچان ہے ۔ سیکھوں انسانی زندگی یا انسانی قوتِ تخلیق کو بے معنی یا "ایبسرڈ" نہیں مانتا ۔ وہ انسان کی محبّت کے ذریعہ انسانی عزم و محنت کو معانی عطا کرتا ہے اور یہی اس ناٹک کا ماحصل ہے ۔

(ڈاکٹر) ہربھجن سنگھ

فہرست

پرانی بوتلیں

کرتار سنگھ دگل

بلونت گارگی کے نام

پیش لفظ

اس ڈرامہ سے متعلق مجھے دو باتیں کہنی ہیں۔ "پُرانی بوتلیں، نئی شراب" ایک مشہور محاورہ ہے۔ اس کہانی میں پانچ جوڑے ہیں۔ زندگی کی جیسے پانچ سیڑھیاں ہوں۔ دس سال سے کم عمر کے روما اور چیتن سے لے کر راموا اور آیا تک جن کی عمریں شاید چالیس سے بھی اوپر ہیں۔ آیا اور راموا، دمینتی اور شیکھر، کیلاش اور کملا، حُسنہ اور پریم، روما اور چیتن، سب کے سب کردار میری نظر میں پُرانی بوتلیں ہیں۔ روما اور چیتن عمر کے لحاظ سے ابھی دس سال سے بھی کم ہیں، اس لیے ان کے بارے میں کوئی قطعی رائے قائم کرنا شاید مناسب نہ ہو، لیکن پھر بھی روما ہیر بنتی ہے اور چیتن رانجھا بن کر خوش ہوتا ہے۔ جب کہانی کا آغاز ہوتا ہے تو وہ یہ کھیل کھیل رہے ہیں۔ جب کہانی ختم ہوتی ہے تو اس وقت بھی وہ اسی کھیل میں لگے ہوتے ہیں۔ حُسنہ اور پریم دونوں اپنی زندگی غیر ذمہ داری اور لاپروائی سے شروع کرتے ہیں اور کہانی کے ختم ہونے پر جو تبدیلی اُن میں آتی ہے اور جس تیزی سے آتی ہے اُس سے یہ قیاس لگایا جاسکتا ہے کہ اور کتنی تبدیلیاں ان کی زندگی میں آسکتی ہیں۔ کیلاش اور کملا نئے بھی ہیں اور پُرانے بھی۔ انھوں نے اپنی زندگی میں نئے پن اور پُرانے پن کے درمیان ایک سمجھوتہ کرلیا ہے۔ دمینتی اور شیکھر نئے پن کو غلط سمجھتے ہیں۔ یہ کوئی نیا پن نہیں کہ جو جی میں آیا کرلیا۔ بالآخران میں شعور بیدار ہوتا ہے تو راموا اور آیا کو نئی روشنی کا ایک تازیانہ لگتا ہے اور وہ لڑکھڑا جاتے ہیں۔

جس طرح کا سب پُرانا پن بُرا نہیں ـــ اس میں جتنا کچھ صحت مند ہے اسے ہمیں زندہ رکھنا چاہیے اور اسی طرح سب کا سب نیا پن برا نہیں، اس میں بہت کچھ اچھا ہے اور اس کا صحیح

استعمال ہونا چاہیے۔

اسی لیے میں نے اس ڈرامے کو "پُرانی بوتلیں" کا نام دیا ہے۔ ان میں سے کئی بوتلوں میں میں نے نئی شراب ڈھال کر دیکھا ہے اور ان میں سے کئی بوتلوں کو میں نے نئی شراب میں خالی رکھ کر دیکھا ہے۔ بہت سی بوتلوں سے نئی شراب صرف چھُو جاتی ہے اور بس ــــ نہ پُرانی بوتلیں بُری ہیں اور نہ نئی شراب بُری ہے۔

زندگی کی اوّلین قدریں پائیدار ہوتی ہیں۔

کرتار سنگھ دگل

کردار

(جس ترتیب سے ڈرامے میں آتے ہیں)

چیتن
دمینتی
شیکھر
روما
آیا
رامو
کیلاش
کملا
پریم
محسنہ
ڈاکٹر

مقام

ایک کوٹھی کا بند برآمدہ۔ جس کے آگے
عام برآمدوں جیسا ایک اور برآمدہ بھی ہے

پہلا ایکٹ

منظر ایک کوٹھی کے بند برآمدے کا ہے جس کے باہر عام برآمدوں جیسا ایک اور برآمدہ ہے۔ اس برآمدے میں کوٹھی کے بالائی کمروں کی جانب کھلی اور چوڑی سیڑھیاں جاتی ہیں۔ نچلے کمروں کی دیواروں میں سامنے اور دائیں بائیں دروازے کھلتے ہیں۔ یہ بند برآمدہ قیمتی قالینوں اور صوفوں وغیرہ سے یوں آراستہ ہے جیسے وہ گول کمرہ ہو۔ اصل میں گول کمرہ اندرونی کمرہ ہے جس کا دروازہ اس دروازے کے سامنے دیوار میں کھلتا ہے۔ اس بند برآمدہ میں ایک طرف پیانو پڑا ہے۔ ایک شیلف میں کتابیں دکھائی دے رہی ہیں اور ایک طرف بچّے کے کھلونے ہیں۔ جب پردہ اٹھتا ہے تو سات آٹھ برس کا ایک بچّہ ٹیلیفون کا کوئی نمبر ملا رہا ہوتا ہے۔

چیتن : (جب نمبر مل جاتا ہے) ہیلو رودا!

....

تجھے یہ کیسے پتہ چلا کہ یہ میرا ٹیلیفون نمبر ہے.... اچھا تو اب جلدی سے آجا...... تو نے کتنی دیر کر دی ہے..... آیا کو ساتھ لے آنا۔ وہ ہمارے نوکر سے باتیں کرتی رہے گی اور ہم کھیلیں گے!

....

میں ــــ میں ابھی تیار ہوا جاتا ہوں، میرا کیا ہے۔ مجھے ربن تو لگانے نہیں۔ رودا یہ بتا کہ آج تو نے کون سا فراک پہنا ہے!

(اکا ایکی اوپر دروازہ کھلتا ہے اور چیتن چونک کر ریسیور کریڈل پر رکھ دیتا ہے اور پرے ایک کونے میں پڑے ہوئے لکڑی کے ایک گھوڑے پر چڑھ کر جھولنے لگتا ہے ـــ اتنے میں دینتی، بچّے کی ماں، پینتیس چالیس سال کی ایک عورت بنی ٹھنی آہستہ آہستہ سیڑھیوں پر سے

اُتر کر آتی ہے۔)

دمینتی : ہیلو بیٹیا !
چیتن : ہیلو امّی !
دمینتی : امی کے پاس آ کر بیٹیا پیار نہیں کرے گا ؟
چیتن : نہیں۔ امّی کی ساڑھی خراب ہو جائے گی۔ میں تو ابھی نہایا بھی نہیں کپڑے بھی نہیں بدلے۔
دمینتی : تمھیں میری ساڑھی کی اتنی فکر کیوں ہے ؟
چیتن : آپ نے مجھے اس روز ڈانٹا تھا جب میں اسکول سے آکر دوڑتا ہوا آپ سے لپٹ گیا تھا۔
دمینتی : (پھیکی ہنسی ہنستے ہوئے) وہ کب بیٹیا ؟
چیتن : اُس روز جب آپ اس کرسی پر ٹیلیفون کے پاس بیٹھے ہوئے پریم انکل کا انتظار کر رہی تھیں۔
دمینتی : ہائے میں مر گئی۔ یہ بھی پریم کا بیری ہو رہا ہے۔ پریم انکل تو بہت اچھے ہیں بیٹیا ! تمہارے لیے کتنی چیزیں لاتے ہیں۔ ٹافیاں، چاکلیٹ، کھلونے، کتابیں.......
چیتن : مجھے تو یہ گھوڑا پسند ہے۔ میرے ڈیڈی لائے تھے نا ـــ
دمینتی : اچھا تو تم اس گھوڑے پر ہی چڑھے رہنا ـ کاٹھ کے گھوڑے پر۔ کاٹھ کا اُلّو !
چیتن : امّی ـ آپ کس کو ٹیلیفون کرنے لگی ہیں !
دمینتی : کسی کو نہیں ـ تم اپنا کام کرو !
چیتن : امّی ـ کیا آپ پریم انکل کو ٹیلیفون کرنے لگی ہیں ؟
دمینتی : نہیں۔
چیتن : تو پھر کس کو ؟
دمینتی : (چُپ رہتی ہے)
چیتن : امّی ـ ابھی حُسنہ آنٹی کا ٹیلیفون آیا تھا ـ ڈیڈی کے بارے میں پوچھ رہی تھیں۔
دمینتی : تم نے کیا کہا ؟
چیتن : میں نے کہا ـــ ڈیڈی اور امّی اُوپر سوئے پڑے ہیں۔
دمینتی : بیٹیا ـــ ذرا دیکھ کر آؤ ـ کیا ڈرائیور آ گیا ہے۔
چیتن : اچھا امّی ـــ....... امّی میں ڈرائیور کو دیکھنے جاؤں گا تو کیا آپ پریم انکل کو ٹیلیفون کریں گی ؟

(ترچھی آنکھوں سے ماں کو چھیڑتا ہے۔)

ومینتی : بکومت! تم وہ کام کرو جو تمہیں بتایا گیا ہے۔ اتنی باتیں بنانی کیوں آگئی ہیں۔

چیتن : اچھا امّی — اچھا امّی!

(باہر چلا جاتا ہے)

دمینتی : (تیزی سے ٹیلیفون کا نمبر ملا کر) ہیلو۔ شیش محل ہوٹل .... کمرہ نمبر 10 چاہیے..... ہیلو دس نمبر؟ میں دمّی ہوں کیلاش۔ میں نے کہا — آج تمہارا شام کا کیا پروگرام ہے؟ .... کوئی خاص نہیں۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ تم کلب جاؤ گے.... کیا؟ نہیں تم آج شام کلب ضرور جاؤ گے.... میرا مطلب یہ ہے کہ تم کلب جاؤ گے تمہاری عدم موجودگی میں مجھے تمہارے کمرے کی ضرورت ہے... کیا.... نہیں۔ میں اپنے ایک دوست کو لاؤں گی۔ ہمیں کوئی ضروری فیصلہ کرنا ہے۔ سوچا۔ باہر کہاں خوار ہوں گے.... اچھا تو تمہاری چابی نیچے ہی ہوگی۔ ریسپشن کلرک کے پاس!.... بہت بہت شکریہ — اچھا کیلاش۔

(ٹیلیفون بند کر کے انگڑائی لیتی ہے)

چیتن : (کمرے میں آکر) ڈرائیور آگیا ہے امّی —

دمینتی : میں باہر جا رہی ہوں بیٹا۔ تم نوکر کے ساتھ سیر کر آنا۔

چیتن : مجھ سے تو روما ملنے آرہی ہے۔

دمینتی : کیوں۔ کیا بات ہے؟ آجکل روما سے بڑی گہری چھن رہی ہے —

چیتن : امّی — مجھے روما بہت اچھی لگتی ہے۔

دمینتی : مجھے اس کی ماں ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ اپنی طرف سے بڑی اپدیشک بنتی ہے جیسے اس نے سب کی پاکدامنی کا ٹھیکہ لے رکھا ہو۔

چیتن : لیکن امّی۔ روما کی امّی روما کو کبھی اکیلی چھوڑ کر نہیں جاتی۔

دمینتی : تم اکیلے کہاں ہو۔ تمہارے پاس رامو ہے، مالی ہے۔ نوکر ہیں۔ میں تو ڈرائیور کو بھی چھوڑ کر جا رہی ہوں۔ اور ابھی تو تمہارے ڈیڈی بھی گھر پہ ہیں۔

چیتن : امّی — روما کی امّی خود بھی اکیلی نہیں جاتی۔

دمینتی : فضول باتیں نہیں کیا کرتے بیٹا —

چیتن : آپ کب واپس آئیں گی؟

دمینتی : آجاؤں گی ـــ یہی کچھ .... جس وقت روز آتی ہوں ـــ
چیتن : امّی ۔ میرے لیے کیا لاؤ گی ؟
دمینتی : کیا لاؤں بیٹا ؟
چیتن : بس ۔ پریم انکل کو نہ لانا ـــ
دمینتی : (پھیکی ہنسی ہنستے ہوئے) بڑے بے ایمان ہو ۔ اچھا ڈرائیور سے جا کر کہو کہ وہ چھوٹی موٹر لے آئے ۔ مجھے دیر ہو رہی ہے ۔
چیتن : اچھا امی ۔

(باہر چلا جاتا ہے)

دمینتی : پریم انکل ! (ایک نشے اور سرور میں اُس کا چہرہ کھِل اٹھتا ہے) پریم انکل کو میں نہیں لاؤں گی میں خود اس کے پاس چلی جاؤں گی ۔ آج ... آج ہم فیصلہ کریں گے ۔ ہائے ! دنیا کتنی خوبصورت اور شیریں ہے ۔ میں پھر دلہن بنوں گی ۔ میں پھر اپنے ہاتھوں میں مہندی رچاؤں گی ۔ میں پھر اپنے پیروں کو رنگوں گی پھر میری کلائیوں میں چوڑیاں چھنکیں گی ... ٹوٹیں گی ... ہائے ! میں پھر سے نئی نئی اور شگفتہ شگفتہ ہو جاؤں گی ۔ جیسے کسی کو جینے کے لیے دو زندگیاں مل جائیں ۔ ہائے ـــ دنیا کتنی میٹھی اور رسیلی ہے ... (ٹیلیفون کی گھنٹی بج اٹھتی ہے ۔)
ہیلو ۔ پریم ؟ ..... بس میں آ ہی رہی ہوں پریمی .... شیش محل ہوٹل کمرہ نمبر دس ..... جی جی ... دس نمبر کوئی برا نمبر نہیں (ہنستی ہے) ہاں سنو پریمی ۔ تم اگر آج بھی بش شرٹ پہن کر آئے تو سچ کہتی ہوں کہ میں اُلٹے پاؤں واپس آجاؤں گی ... اچھا میں آ رہی ہوں ... جی .... جی ... کیا میں تمہیں راستہ میں لے لوں ـــ اچھا ۔ بہت اچھا ..... اچھا پریم ۔

(ریسیور کریڈل پر رکھ دیتی ہے)

چیتن : (کمرے میں آکر) امی ۔ موٹر آگئی ۔
دمینتی : اچھا بیٹا ـــ تم کوکو پی لینا ۔
چیتن : اچھا امی ۔ (آگے بڑھ کر ماں کے پیار کے لیے منہ اوپر اٹھاتا ہے) امّی ۔
دمینتی : ہائے بیٹا ـــ تمہیں پیار کروں ؟ تیرا منہ کتنا گندہ ہو رہا ہے ۔

(بچے کے ماتھے پر بوسہ دیتی ہے ۔ پھر پرس میں سے آئینہ نکال کر لپ اسٹک دیکھتی ہوئی باہر چلی جاتی ہے)

چیتن : ٹاٹا امّی !
ممیتی : ٹاٹا۔ بیٹے!

(ماں کے موٹر میں باہر چلے جانے کے بعد چیتن پھر ٹیلیفون گھماتا ہے)

چیتن : روما۔ تو ابھی وہیں ہے — جلدی آجانا روما...... کیا؟..... نہیں..... کیوں؟ ..... روما ضرور آ..... میں تجھے گھوڑے پر بیٹھنے دوں گا۔ میں تجھے اپنی سائیکل چلانے کے لیے دوں گا۔ جھولا جھولنے دوں گا۔ میں تجھے لالی پاپ دوں گا — چیونگ گم دوں گا۔ کوکا کولا پلاؤں گا۔ تو کب گھر سے چلے گی ؟

(اتنے میں اوپر کا دروازہ کھلنے کی پھر آواز آتی ہے۔ بچّہ چونک کر رسیور کریڈل پر رکھ دیتا ہے اور پرے کونے میں پڑے ہوئے کاٹھ کے گھوڑے پر پھر جھولنے لگتا ہے۔ بچّے کا باپ شیکھر چالیس بیالیس کا ایک مرد بنا سنورا آہستہ آہستہ سیڑھیوں پر سے اترتا ہے)

شیکھر : ہیلو۔ بیٹے صاحب!
چیتن : ہیلو
شیکھر : ٹیلیفون کون کر رہا تھا؟
چیتن : میں۔
شیکھر : تم کسے ٹیلیفون کر رہے تھے؟ روما کو؟
چیتن : جی۔
شیکھر : بچّے اس طرح ٹیلیفون سے نہیں چپٹے رہتے۔
چیتن : جی۔
شیکھر : کیوں۔ تمہاری امّی گئیں؟
چیتن : ہاں
شیکھر : چھوٹی موٹر میں گئی ہیں؟
چیتن : جی۔
شیکھر : ڈرائیور بھی ساتھ گیا ہے؟
چیتن : نہیں۔

شیکھر : تمہاری اتی کب واپس آئیں گی۔ کچھ کہہ کر گئی ہیں ؟

چیتن : نہیں۔

شیکھر : کھانا کیا آکر کھائیں گی ؟

چیتن : معلوم نہیں۔

شیکھر : کوئی ٹیلیفون آیا تھا ؟

چیتن : جی۔

شیکھر : حُسنہ آنٹی کا ٹیلیفون آیا تھا ؟

چیتن : جی۔

شیکھر : تو تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ مجھے جگایا کیوں نہیں ؟

چیتن : (چپ رہتا ہے)

شیکھر : جب کسی کا ٹیلیفون آتا ہے تو اسے بتا دیا کرتے ہیں۔

چیتن : جی۔

شیکھر : یہ تم نے اپنا کیا حال بنا رکھا ہے۔ جاؤ۔ جا کر کپڑے تبدیل کرو۔

چیتن : اچھا۔

(باہر چلا جاتا ہے)

شیکھر : حُسنہ آنٹی نے ٹیلیفون کیا تھا! (نشے سے اس کی پلکیں بوجھل ہو جاتی ہیں) حسنہ کتنی حسین ہے۔ بھولی بھالی سی معصوم سی۔ نازک سی۔ کومل سی —! اچھوتے حُسن کے پہلے پیار کی تلخی —! یہ بے کلی کیسی ہوتی ہے —— میں نے کہا تھا کہ ٹیلیفون میں کروں گا مگر اس سے انتظار نہ ہو سکا۔ یہ پیار کیسا ہوتا ہے۔ مذہب کے بندھنوں سے بالاتر — قوموں سے ماورا — عمر سے بے نیاز آج شام فیصلہ ہو جائے گا ... آج شام فیصلہ ہو جائے گا اور اب مزید انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ آج شام ... (ایک دم جیسے اسے کوئی خیال آجاتا ہے) اوہو — آج شام کا تو مجھے انتظام بھی کرنا ہے — آج شام کہاں گزاری جائے —— (سوچتے ہوئے ٹیلیفون گھماتا جاتا ہے) آج کی شام کہاں گزاری جائے۔ ہیلو شیش محل ہوٹل — کمرہ نمبر دس چاہیے ہیلو۔ کمرہ نمبر دس — کون کیلاش بول رہا ہے میں شیکھر ہوں کیلاش .... میں نے کہا آج شام تمہارا کیا پروگرام ہے ... تم کلب جا رہے ہو نا —؟ ... تو پھر ٹھیک ہے۔ تمہارے کمرے کی مجھے پھر ضرورت ہے ... نہیں ... نہیں تم ضرور

کلب جا رہے ہو۔ سمجھی بات یہ ہے کہ میں اپنی ایک دوست کو لانا چاہتا ہوں۔ ہمیں کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔ ایسی باتیں جو باہر نہیں کی جا سکتیں... کیلاش میں کچھ سننے کو تیار نہیں۔ تم چابی نیچے چھوڑ جانا۔ میں شام میں آ ہی رہا ہوں ـــــ میں نے کہا کیلاش ـــ میں کچھ سننے کو تیار نہیں ہوں۔ بس تم چابی نیچے چھوڑ جانا۔

(کیلاش اُدھر سے کچھ کہہ ہی رہا ہوتا ہے کہ شیکھر رسیور کریڈل پر رکھ دیتا ہے)

چیتن : (کمرے میں آ کر) اُوں ہوں ـــــ (یوں کھنکارتا ہے جیسے وہ کمرے میں آ رہا ہو)

شیکھر : اچھا۔ تو تم تیار ہو کر آ گئے بیٹا ـــ!

چیتن : جی۔۔

شیکھر : آج شام کو تمہارا کیا پروگرام ہے ـــ گھر پر ہی رہو گے؟

چیتن : جی۔

(ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے لگتی ہے)

شیکھر : ہیلو ـــ۔۔۔ ہاں کیلاش..... میں نے کہا کہ میں کچھ سننے کے لیے تیار نہیں۔ چابی نیچے چھوڑ جانا ـــ میں ضرور آؤں گا...... میں کچھ سننے کے لیے تیار نہیں۔

(کیلاش کچھ کہنے کی کوشش کر رہا ہوتا ہے کہ شیکھر پھر رسیور کریڈل پر رکھ دیتا ہے۔ چیتن پھر کاٹھ کے گھوڑے پر جا بیٹھتا ہے)

شیکھر : تمہیں یہ کاٹھ کا گھوڑا بہت پسند ہے بیٹا!

چیتن : (چپ رہتا ہے)

(ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے اور بجتی رہتی ہے۔ کچھ دیر کے لیے کوئی نہیں سنتا)

شیکھر : بیٹا۔ ٹیلیفون سُننا۔ اگر کیلاش انکل کا ہو تو کہہ دینا کہ ڈیڈی چلے گئے۔

چیتن : (رسیور اٹھا کر) ہیلو۔

شیکھر : کس کا فون ہے۔ کیا کیلاش انکل کا ہے؟

چیتن : نہیں۔

شیکھر : حُسنہ آنٹی کا ہے؟

چیتن : جی۔
شیکھر : بیٹا۔ تم ڈرائیور سے جاکر کہو کہ موٹر لے آئے۔
چیتن : اچھا۔ (باہر چلا جاتا ہے)
شیکھر : (ٹیلیفون سنتے ہوئے۔) ہیلو۔ حسنہ! بس میں آ ہی رہا ہوں.... ہاں میں نے انتظام کرلیا ہے۔ شیش محل ہوٹل۔ کمرہ نمبر دس!..... ہاں دس نمبر۔ میں آ ہی رہا ہوں۔ موٹر باہر کھڑی ہے... کیا میں تمہیں راستہ میں لے لوں.. اچھا بہت اچھا۔ ہاں ــــ آج تم نے کون سی ساڑھی پہنی ہے..... شکریہ! اچھا۔ بائی۔ بائی۔

(ریسیور کریڈل پر رکھ دیتا ہے)

چیتن : (کمرے میں آکر) ڈیڈی!
شیکھر : موٹر آگئی بیٹا!
چیتن : جی۔
شیکھر : اچھا۔ بیٹا۔ میں جا رہا ہوں ــ تم نوکر کے ساتھ سیر کے لیے باہر چلے جانا۔
چیتن : اچھا۔

(ٹیلیفون کی گھنٹی پھر بجتی ہے)

شیکھر : بیٹا۔ ٹیلیفون سننا ــ کیلاش انکل کا ہوگا۔ اُن سے کہنا کہ ڈیڈی چلے گئے۔

(باہر چلا جاتا ہے)

چیتن : (ٹیلیفون سنتے ہوئے) ہیلو...... انکل آں...... ڈیڈی بھی گئے۔ امّی بھی گئیں.. .... امّی اپنی موٹر میں اور ڈیڈی اپنی موٹر میں۔

(چیتن باہر سے آتی ہوئی روما کو دیکھ لیتا ہے اور ہاتھ اٹھا کر اس کا جیسے خیر مقدم کرتا ہے ــ اور پھر عجلت میں ٹیلیفون چھوڑنا چاہتا ہے)

ہاں انکل!..... نہیں انکل..... ہاں انکل..... اچھا انکل ــــ اچھا

(ریسیور کریڈل پر رکھ دیتا ہے)

روما : (ببی دھمی آتی ہے۔ روما کی عمر چھ سات سال کی ہے) ہیلو۔
چیتن : ہیلو روما!
روما : (ہنستے ہوئے) میں نے نیلا فراک پہنا ہے اور تم نے نیلی بُش شرٹ! یہ کیسی بات ہوئی۔

چیتن : تم ٹھیک کہہ رہی ہو روما
روما : مجھے یہ نیلا فراک بہت پسند ہے۔
چیتن : تمہاری آیا کہاں ہے ـــــ؟
روما : باہر۔ تمہارے نوکر سے باتیں کر رہی ہے۔
چیتن : رامو سے ؟
روما : ہاں ـــ رامو سے ہماری آیا بہت باتیں کرتی ہے ـــــ کبھی رامو ہمارے یہاں بیٹھا رہتا ہے اور کبھی آیا تمہارے یہاں آئی رہتی ہے۔
چیتن : رامو کی بیوی نے اس روز خوب جوتے لگائے تھے۔
روما : کس کو ؟
چیتن : رامو کو اور کس کو
روما : کیوں ؟
چیتن : میں کیا جانوں ـــ تمہاری آیا اور رامو باغیچے میں بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے ـــــ اوپر سے رامو کی بیوی آگئی۔ پہلے اس نے آیا کے بال نوچے ـــ پھر رامو کو جوتے مارتے ہوئے اپنے کوارٹر میں لے گئی۔
روما : سچ ؟ (ہنسنے لگتی ہے)
چیتن : اور اب خود روٹھ کر میکے چلی گئی ہے۔
روما : سچ ؟ (ہنستی چلی جاتی ہے۔)
چیتن : اور وہاں سے اس کے بھائیوں نے یہ سندیسہ بھیجا ہے کہ رامو نے اگر پھر کبھی تمہاری آیا سے بات کی تو وہ اسے جان سے مار ڈالیں گے۔
روما : سچ ؟
چیتن : اور آجکل رامو تھر تھر کانپ رہا ہے۔

(دونوں ہنستے ہیں)

روما : دیکھو تو سہی۔ اِدھر ہی آرہے ہیں۔
چیتن : ہاں۔ میں کہتا ہوں روما ـــ یہ پیانو پڑا ہے۔ اس کے پیچھے چھپ کر ان کی باتیں سنیں۔
روما : (ہنستے ہوئے) آؤ۔

(دونوں تیزی سے پیانو کے پیچھے چھپ جاتے ہیں۔ اتنے میں رامو اور آیا آتے ہیں۔)

آیا : یہ بچے کہاں گئے ؟

رامو : یہیں کہیں ہوں گے۔ آجکل کے بچّے تو بڑوں کے کان کترتے ہیں۔

آیا : آج کان کترنے کی بات نہ کرو۔ اس روز تمہاری لڑاکو بیوی مجھ سے کہنے لگی ـــ "میں تیری ناک بھی کاٹ دوں گی اور تیرا کان بھی!"

رامو : سنتی کا غصّہ بڑا ظالم ہے ـــ

آیا : تم اُس سے ڈرتے کیوں ہو؟

رامو : (ایک دم بدلتے ہوئے) ڈرتا کون ہے۔ میں تو نہیں ڈرتا۔

آیا : ڈرتے نہیں ہو تو تمہارے ہاتھ کیوں کانپ رہے ہیں؟

رامو : وہ تو..... وہ تو مجھے سردی لگ رہی ہے ـــ

آیا : تمہیں گرمیوں میں بھی سردی لگتی ہے ـــ؟

رامو : نہیں نہیں۔ یہ پنکھا جو چل رہا ہے۔

آیا : رامو ـــ تم مانو نہ مانو ـــ تم سنتی سے بہت ڈرتے ہو۔

رامو : بھلی مانس۔ اپنے بچّے کی ماں سے مرد ذرا ڈرتا ہی ہے۔

آیا : (ناراض ہوتے ہوئے) تو پھر تم مجھے کیوں خوار کر رہے ہو ؟

رامو : تم تو خفا ہو گئیں ـــ جان من ـــ تم تو مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔

آیا : اچھی میں لگتی ہوں اور ڈرتے تم سنتی سے ہو۔ مجھے یہ تمہاری حرکتیں پسند نہیں۔ بابا میں تو چلی۔

رامو : کہاں چلیں میری جان۔ صوفے پر بیٹھو۔ اپنا ہی گھر ہے۔

(رامو آیا کو صوفے پر اپنے ساتھ بٹھا لیتا ہے۔)

آیا : ابھی بچّے آجائیں گے۔

رامو : تم میرے ہتھکنڈے سمجھتی نہیں ہو ـــ جہاں میں بیٹھا ہوں وہاں سے سب کچھ دکھائی دیتا ہے۔ کون باہر سے آرہا ہے ـــ اور کون باہر جا رہا ہے۔

آیا : بچّے تو گھر ہی میں ہیں۔

رامو : کہیں باہر باغیچے میں کھیل رہے ہوں گے۔

آیا : ہماری بے بی تمہارے گھر کے لڑکے کو ہر وقت یاد کرتی رہتی ہے۔
رامو : ہمارا لڑکا اسے ہر وقت ٹیلیفون کرتا رہتا ہے۔
آیا : جوڑی اچھی ہے۔
رامو : جوڑا تو ہمارا بھی بُرا نہیں۔
آیا : تمہارا جوڑ سنتی سے ہے۔ مجھ سے کیسا ؟
رامو : میری جان — یہ بات نہ کہو — مجھے تو تم بہت ہی اچھی لگتی ہو۔
آیا : اور سنتی ؟
رامو : وہ تو میرے بچّے کی ماں ہوئی۔
آیا : اگر تم اب سنتی کو اس کے میکے سے لائے تو میں تمہاری کبھی صورت نہیں دیکھوں گی۔
رامو : یہ بات نہ کہو — پرتیو !
آیا : اُس روز باغیچے میں اُس نے میرے بال نوچے تھے۔
رامو : پھر کیا ہوا۔ مجھے بھی تو........
آیا : ہاں — تمہاری بھی جوتوں سے مرمّت ہوئی تھی۔
رامو : مجھے کون مار سکتا ہے۔ میں اس کا خون نہ پی جاؤں۔
آیا : اس روز جب میں چلی گئی تو اس نے تمہاری کیا گت بنائی تھی ؟
رامو : پیاری — سنتی کی بات اور ہے — میں نے اس کا حق جو چھین لیا ہے۔
آیا : اور اس نے تمہارے جوتے لگائے — بات ایک جیسی رہی۔
رامو : پرتیو — میں نے تمہیں بتایا ہے کہ سنتی کی بات اور ہے — وہ تو نکّو کی ماں ہے —
آیا : جاؤ جہنّم میں.... حرامی کہیں کا — کھاؤ جوتیاں — (منہ چڑاتے ہوئے) "نکّو کی ماں کی بات اور ہے —" مجھے کیوں خوار کر رہے ہو۔ میں تو واپس چلی۔
(اُٹھتے ہوئے آواز دیتی ہے)
بے بی — بے بی — تو کہاں چلی گئی۔
روما : (پیانو کے پیچھے سے نکلتے ہوئے) آئی۔
رامو اور آیا : ہیں — تم یہاں چھپی ہوئی تھیں۔
چینین : (پیانو کے پیچھے سے باہر آتے ہوئے) ہاں — ہم یہاں چھپے ہوئے تھے۔

(بچّے ہنسنے لگتے ہیں)

آیا : (شرمندہ ہوکر باہر جاتے ہوئے) میں نہ کہتی تھی کہ آجکل کے بچّے تو بڑوں کے کان کرتے ہیں۔

رامو : (تھر تھر کانپتے ہوئے) میرا تو بیڑا ہی غرق ہوگیا۔ اگر بی جی کو پتہ چل گیا کہ میں صوفے پر بیٹھا ہوں تو نہ جانے میرا کیا حال ہوگا۔

(دونوں باہر چلے جاتے ہیں۔ بچّے ابھی تک ہنس رہے ہیں)

چیتن : (ہنستے ہنستے صوفے پر جا بیٹھتا ہے اور روما کو اشارہ کرتا ہے) اری پرتیو! میرے پاس آکر بیٹھ جا ——

روما : ارے رامو —— میں تمہارے پاس کیا بیٹھوں ——

چیتن : پرتیو۔ بیٹھ بھی جا —— کوئی دیکھ نہیں رہا ہے۔

روما : (بیٹھتے ہوئے) تیری لڑاکو بیوی نے اس روز میری بری گت بنائی تھی۔

چیتن : پرتیو۔ اس کی بات چھوڑ۔ وہ تو میرے بچّے کی ماں ہے۔

روما : اے رامو! اس روز تیری جابر بیوی نے میرے بال نوچے تھے۔

چیتن : اری پرتیو۔ تو اس کی بات چھوڑ۔ وہ تو میرے نکّو کی ماں ہے۔

(دونوں پھر ہنس پڑتے ہیں اور ہنستے ہنستے چلے جاتے ہیں۔)

روما : ہیں —— یہ ٹیکسی میں کون آیا ہے ——

چیتن : کیلاش انکل —— ان کے ساتھ کملا آنٹی ہیں۔ ہماری اُستانی!

روما : چلو بابا۔ چلو۔ میں نے تو ابھی اپنا سبق بھی یاد نہیں کیا ہے۔

(دونوں جلدی سے پہلو کے دروازے سے باہر چلے جاتے ہیں۔)

کیلاش : (ہنستا ہوا آتا ہے) میدان صاف ہے —— نہ ٹیلیفون کرنے کی ضرورت، نہ دروازہ کھٹکھٹانے کی۔ ہو بہو جیسا میں نے سوچا تھا گھر خالی پڑا ہے۔

کملا : تم بار بار ہنس کیوں رہے ہو؟

کیلاش : ہنسنے کی تو بات ہے کملا ——

کملا : میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ آج کی شام ....
کہیں تنہائی میں گزاریں گے ——
اور تم مجھے یہاں لے آئے —— یہاں کتنی دیر تک بیٹھیں گے ؟

کیلاش : کملا ___ آج کی شام ، یہ گھر اس شہر میں سب سے بڑا گوشۂ تنہائی ہے۔
(پھر ہنسنے لگتا ہے۔)

کملا : تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی ۔

کیلاش: ہاں کملا ___ ان باتوں کو آدمی جتنی دیر تک نہ سمجھے اتنا ہی سکھی رہتا ہے ۔

کملا : ہاں ___ ایک سکھ اندھیرے کا ہوتا ہے ۔

کیلاش: اور ایک سکھ اجالے کا ہوتا ہے ۔

کملا : اور ایک سکھ ہوتا ہے ___ آنکھیں چاہے کھُل جائیں پھر بھی کبھی کبھی آنکھیں بند کر لینا ___ اپنے گردوپیش سے بے نیاز ہو جانا ۔

کیلاش : سنگلاخ حقیقتوں کا سامنا نہ کرنا اور دشواریوں کو ٹال دینا ___

کملا : کئی بار یوں غفلت میں کنارے کی سیڑھی جان لیوا بن جاتی ہے ۔زندگی بھر کا دکھ بن جاتی ہے ۔

کیلاش : تو پھر تم نے اپنی مشکل کو حل کرنے کے لیے کیا کچھ کیا ہے ___؟

کملا : میں تو سوچتی ہوں کہ زندگی ایک سمجھوتہ ہونی چاہیے ۔ جو چیز آدمی کو جس جگہ بھی اچھی لگے اُسے پلّو سے باندھ لے ۔

کیلاش: بزرگوں کے وسیع تجربے کے نتائج اکثر نئی زندگی کی ناؤ کو چار قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکتے ۔

کملا : لیکن زندگی کی اولین قدریں اٹل ہوتی ہیں ۔ وہ کبھی نہیں بدلتیں ۔ جیسے دو اور دو ہمیشہ چار ہوتے ہیں اور ہمیشہ چار ہی رہیں گے ۔

کیلاش : میں نے پوچھا تھا کہ تم نے اپنی مشکل کو حل کرنے کے لیے کیا سوچا ؟

کملا : میں سوچتی ہوں کیلاش کہ کوئی کسی طرح ہمارے ماں باپ کے دل میں وہ بات ڈال دے جو ہم چاہتے ہیں ۔

کیلاش: پھر ایک گھر سے پیغام دوسرے گھر جائے ۔ اچھا تو یہی ہے کہ پہل ہماری طرف سے ہو اور پھر تمہارے گھر کے لوگ مجھے دیکھنے آئیں اور ہمارے گھر کے لوگ تمہیں دیکھنے جائیں ۔ پھر شگن دیا جائے ۔ پھر رنگ گھر سے جائیں تیہنائیاں بجیں ۔ پھر دھوم دھڑکا ہو ۔ بھائی بہنوں ، رشتے داروں اور دوستوں کو بلوایا جائے اور ان سب کی موجودگی میں یہ فیصلہ کیا جائے کہ کملا اور کیلاش ، کیلاش اور کملا . . .
(دونوں ہنسنے لگتے ہیں)

کملا : کیوں ___ کیا اس میں مزہ نہیں ؟

کیلاش: ہاں ۔ زندگی میں رونق بھی ضروری ہے ۔ زندگی میں رنگوں کی بھی ضرورت ہے ۔ اگرچہ یہ رنگ کئی بار زیادہ گاڑھے ہو جاتے ہیں، ذرا زیادہ پکے ہو جاتے ہیں ۔ اور سفید بھی تو ایک رنگ ہی ہے ۔

کملا: کیا سفید رنگ کی سدا بہار سفیدی سے کوئی اکتاتا نہیں ہے ۔؟

کیلاش: سفید میں سب رنگ چھپے ہوئے ہیں ۔ سفید رنگ سے کبھی کوئی نہیں اکتایا ۔

کملا: جیسے سچ اٹل ہے ۔

کیلاش: پھر سفید رنگ کی کئی قسمیں ہوتی ہیں ۔

کملا: سفید رنگ اچھا رنگ ہے لیکن سفید کے ساتھ کوئی اور رنگ رکھ دیا جائے تو سفید رنگ کی سفیدی کچھ اور بھی نکھر آتی ہے ۔ سفید زیادہ سفید معلوم ہونے لگتا ہے ۔

کیلاش: زندگی ایک کڑی آزمائش ہے ۔ ہر قدم پر کوئی نہ کوئی گرہ کھولنی پڑتی ہے ۔

کملا: کئی گرہوں کو کھولنے کے طریقے پرانے ہیں مگر آزمودہ ہیں ۔ کئی گرہوں کے لیے نیا ڈھنگ ڈھونڈنا پڑتا ہے ۔

کیلاش: قصہ کوتاہ ۔ آدمی کے ہوش و حواس ٹھکانے رہنے چاہئیں ۔

چیتن: (کمرے میں آ کر) ہیلو انکل ۔ ہیلو آنٹی !

کملا: ہیلو چیتن !

کیلاش: کیا حال ہے تمہارا بیٹے؟

چیتن: مجھے روما کے گھر ٹیلیفون کرنا ہے ۔

کیلاش: کیوں؟ کیا بات ہے؟

چیتن: میں اور روما "گھر ۔ گھر" کھیل رہے تھے ۔ میں رانجھا بنا ۔ روما ہیر بنی ۔ میں جھوٹ موٹ کی بھینس چرانے گیا اور وہ جھوٹ موٹ کی "چوری" لے کر آئی ۔ باغیچے میں ہم جھوٹ موٹ کی باتیں کرتے رہے، کرتے رہے ۔ یہ باتیں کرتے کرتے ہم لیٹ گئے ۔ اور یوں جھوٹ موٹ لیٹے لیٹے روما واقعی سو گئی ۔ اور اب اٹھتی ہی نہیں ۔ میں جگا جگا کر تھک گیا ۔

کملا: کہیں تیری روما کو سانپ تو نہیں سونگھ گیا؟

کیلاش: چلو ۔ ہم چل کر تیری ہیر کو دیکھتے ہیں ۔

(تینوں ہنستے ہوئے باہر جاتے ہیں ۔ ابھی وہ باہر نکلتے ہی ہیں کہ رامو اور آیا ہنستے ہوئے دائیں طرف کے دروازے سے آتے ہیں ۔)

رامو : (ہنستے ہوئے) ہماری باتیں بچّوں نے سنیں۔ اور ہم نے بھی صاحب بہادروں کی بات سن لی۔

آیا : پردے کے پیچھے چھپے ہوئے میرا دل یوں دھڑک رہا تھا جیسا ڈھول بج رہا ہو۔

رامو : تیری سمجھ میں بھی کچھ آیا کہ وہ کیا باتیں کر رہے تھے ——؟

آیا : میری سمجھ میں تو خاک نہیں آیا لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ کچھ ایسی باتیں کر رہے تھے جیسی تم مجھ سے کرتے رہتے ہو——

رامو : کیلاش بابو تو کنوارے ہیں!

آیا : کملا بی بی بھی کنواری لگتی ہیں۔

رامو : آجکل کی عورتوں کا کچھ پتہ نہیں۔ کنواریاں بیاہتا دکھائی دیتی ہیں اور بیاہتا کنواریاں نظر آتی ہیں—— (ہنستا ہے)

آیا : یہ مرد ذات! تم عورتوں کے بارے میں یہی باتیں کرتے ہو۔ ویسے اگر تو نہ آئے تو تم عورت کی غلاظت تک کھا جاؤ۔

رامو : دیکھو پیاری —— سامنے ہمارے باغیچے میں پڑوسیوں کے ڈھور ڈنگر آگئے ہیں۔ میں ان کو بھگا کر آتا ہوں —— (باہر چلا جاتا ہے)

آیا : جب گھر میں کوئی نہ ہو—— کئی راہگیر آکر منہ مارتے ہیں۔

(ایک پل کے لیے آیا خیالوں میں کھو جاتی ہے اور اس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آتے ہیں)

آہ۔ میرے پہلے سرتاج —— اگر تو مجھے یوں چھوڑ کر نہ جاتا تو میں آج کیوں ذلیل و خوار ہوتی۔ ویران حویلی کی طرح۔ جو کوئی بھی آتا ہے کچھ نہ کچھ اتار کر لے جاتا ہے۔

روما : (کمرے میں آکر) آیا—— مجھے گھر جانا ہے۔

چیتن : میں بھی روما کے ساتھ جاؤں گا۔

آیا : چلو۔ چلو۔ مگر وہ مہمان کہاں ہیں؟

چیتن : انکل اور آنٹی باغیچے میں ہیں۔

آیا : وہ وہاں کیا کر رہے ہیں؟

چیتن : پہلے میں رانجھا بنا تھا اور روما ہیر بنی تھی۔ اب انکل رانجھا بنے ہیں اور آنٹی ہیر بنی ہے۔

روما : انکل کی ہیر کہیں گم گئی ہے اور اب وہ اسے باغیچے میں ڈھونڈ رہے ہیں۔

(باہر موٹر کی آواز)

چیتن : ڈیڈی آ گئے۔

روما : موٹر کو گیراج میں رکھنے گئے ہیں شاید۔

چیتن : ہاں — موٹر کو گیراج میں سے ڈرائیور نکالتا ہے اور میرے ڈیڈی ہمیشہ اُسے گیراج میں خود رکھنے جاتے ہیں۔

روما : ایک رات ہمارا کھانا باہر تھا — واپس آتے ہوئے میں موٹر میں سو گئی۔ میرے ڈیڈی اور امی اگلی سیٹ پر بیٹھے تھے — میرے ڈیڈی نے موٹر گیراج میں رکھی۔ گیراج کا دروازہ بند کیا اور خود جا کر سو گئے۔ میں ساری رات موٹر میں سوئی رہی۔

آیا : آج کل کے ماں باپ کا یہی حال ہے۔

(نیکھر جیسے غصہ سے بھرا ہوا آتا ہے اور بچوں کی طرف دیکھے بغیر سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلا جاتا ہے۔)

چیتن : ڈیڈی —

روما : تمہارے ڈیڈی غصے میں ہیں۔

آیا : صاحب غصے میں ہیں۔ چلو روما چلیں۔

چیتن : روما — میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔

روما : کیوں آیا —

آیا : جیسی تمہاری مرضی بیٹی — چلو تو پھر چلیں —

(آیا اور بچے باہر چلے جاتے ہیں۔ وہ باہر نکلتے ہیں کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے لگتی ہے۔ گھنٹی بجتی رہتی ہے اور رامو دوڑتا ہوا آتا ہے۔)

رامو : (ٹیلیفون سنتے ہوئے) جی — صاحب تو باہر گئے ہوئے ہیں ...... جی بی بی جی بھی باہر گئی ہوئی ہیں .... جی —؟ جی نہیں۔ دونوں الگ الگ گئے ہیں۔ اپنی اپنی موٹر میں .... جی پتہ نہیں کب آئیں ... اچھا جی ... بہت اچھا جی۔ میں کہہ دوں گا۔

(رامو ٹیلیفون رکھتا ہی ہے کہ باہر موٹر آ کھڑی ہوتی ہے جس میں سے دمینتی نکلتی ہے۔)

رامو : میم صاحب — میم صاحب آ گئیں۔

(دمینتی چپ ہے اور غصہ سے آگ بگولا ہو رہی ہے)

راموؔ : میم صاحب — آپ کا ٹیلیفون آیا تھا۔

(راموؔ کو جواب دیے بغیر دمینتی کھٹ کھٹ کرتی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلی جاتی ہے — دروازہ زور سے بند کرنے کی آواز آتی ہے)

راموؔ : ارے باپ رے باپ — یہ تو بہت غصّہ میں معلوم ہوتی ہیں۔ عورت کو غصّے میں دیکھ کر میرے دانت بجنے لگتے ہیں۔

کیلاشؔ : (کملا کے ساتھ باغیچے میں سے آتے ہوئے) کیوں راموؔ — تمہارے صاحب آ گئے ؟

راموؔ : صاحب تو نہیں آئے۔ میم صاحب آ گئیں۔

(اتنے میں اوپر کمرے میں شیکھر اور دمینتی کے بلند آواز میں جھگڑنے کی آواز آتی ہے —)

کملاؔ : شیکھر تو اوپر ہے۔

کیلاشؔ : ہاں۔ دونوں ہی اوپر ہیں —

راموؔ : میں نے صاحب کو آتے ہوئے نہیں دیکھا۔

(جھگڑنے کی آواز اور بلند ہو جاتی ہے۔ اور پھر چینی کے برتنوں کے ٹوٹنے کی آواز آتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ دمینتی کی چیخ سنائی دیتی ہے —)

کیلاشؔ : چلو بابا۔ چلیں۔ کسی کی گھریلو زندگی میں دخل دینا مناسب نہیں۔

کملاؔ : تم نے اچھی تنہائی کی جگہ ڈھونڈی۔ طوفان سے پہلے کی خاموشی!

کیلاشؔ : (باہر جاتے ہوئے) جو آگ نگلتے ہیں وہ انگارے ہی اگلتے ہیں۔

(کیلاش اور کملا چلے جاتے ہیں۔ اوپر جھگڑنے اور چیزوں کے ٹوٹنے کی آواز اور بھی بلند ہو جاتی ہے۔ لڑنے جھگڑنے کی آواز جوں جوں اونچی ہوتی جاتی ہے راموؔ کی آنکھیں ڈر سے پھٹی جاتی ہیں۔ پھر وہ فرطِ خوف سے تھر تھر کانپنے لگتا ہے۔ راموؔ کانپ رہا ہوتا ہے کہ پردہ گرتا ہے۔)

دوسرا ایکٹ

تین مہینے بعد ـــــ منظر اسی بند برآمدے کا ہے ـــ سامنے صوفے پر دمینتی اور پریم بیٹھے ہیں۔ ٹھیک اُس جگہ جس جگہ پہلے ایکٹ میں راموا اور آپا بیٹھے تھے۔
جہاں سے باہر آنے اور جانے والا دکھائی دیتا ہے۔
پریم کی عمر کوئی پچیس برس کے لگ بھگ ہے۔
پردہ اُٹھتا ہے۔ پریم کے ہونٹوں میں سگریٹ ہوتا ہے۔ دمینتی دیا سلائی جلا کر اس کا سگریٹ سلگا رہی ہے۔

پریم : (سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے) تم یہ بتاؤ کہ مجھے سگریٹ پلا کر تمہیں کیا مزہ آتا ہے ـــ؟

دمینتی : جو کام کوئی خود نہ کر سکے اُسے دوسرے سے کرا کر وہ اپنی خواہش پوری کر لیتا ہے۔

پریم : تمہیں سگریٹ پینے سے کون روکتا ہے ـــ؟

دمینتی : روک کون سکتا ہے ــ مجھے خود ہی عورتوں کا سگریٹ پینا عجیب لگتا ہے۔

پریم : میں جو بھی سگریٹ پیتا ہوں تمہارے سامنے پیتا ہوں۔ دس منٹ تمہارے پاس بیٹھ کر مجھے جیسے سگریٹ کی طلب محسوس ہونے لگتی ہے۔ ویسے میرے دفتر میں سارا دن لوگ سگریٹ پیتے رہتے ہیں مگر میں نے کبھی ہاتھ بھی نہیں لگایا۔

دمینتی : اور سگریٹ پیتے ہوئے تم مجھے بہت پیارے لگتے ہو۔

پریم : مجھے تو عورت کا سگریٹ پینا اچھا لگتا ہے۔ کسی حسین عورت کے ہونٹوں پر سلگتے ہوئے سگریٹ کا دھواں یوں لگتا ہے جیسے چاند کے اوپر سے پتلے پتلے بادل پھسل رہے ہوں ـــ اور پھر ایک کش لگا کر عورت کی پلکوں کا بند ہونا اور کھلنا.... تم سگریٹ پی کر تو دیکھو ـــــ

دمینتی : (چھیڑتے ہوئے) میں کوئی حسین عورت تھوڑے ہی ہوں۔

پریم : (ہنستے ہوئے) بدشکل عورتیں بھی تو سگریٹ پیتی ہیں۔

دمینتی : میری نظر میں سگریٹ کے معاملے میں میرے اندر جو میری انا ہے وہ بہت طاقتور ہے۔

پریم : اچھا۔ ایک بار پی کر تو دیکھو۔

دمینتی : نہیں پریم۔ مجھے تم سگریٹ پیتے ہوئے اتنے ہی اچھے لگ رہے ہو جتنی ایک حسین عورت

سگریٹ کے کش لگاتی ہوئی تمہیں اچھی لگتی ہے۔

پریم : جبھی میرے ہونٹوں میں سگریٹ دیے جاتے ہیں؟

دمینتی : میرے پرس میں تمہارے لیے ہمیشہ سگریٹ ہوتے ہیں۔ میرے گھر میں ہمیشہ سگریٹ تمہارا انتظار کرتا ہے۔

پریم : ہاں — شیکھر صاحب تو سگریٹ نہیں پیتے؟

دمینتی : نہ میں سگریٹ پیتی ہوں نہ شیکھر — اس گھر میں صرف تم سگریٹ پیتے ہو —

پریم : میں بھی بس اس وقت سگریٹ پیتا ہوں جب اس گھر کی مالکن کے پاس ہوتا ہوں۔

چیتن : (بائیں طرف کے کمرے میں سے) امّی۔

دمینتی : آئی بچے — !

پریم : کیا حال ہے اب چیتن کا۔

دمینتی : حال اچھا نہیں۔ بخار اتر نہیں رہا ہے — کبھی بڑھ جاتا ہے، کبھی کم ہو جاتا ہے — بیچارے کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو چکا ہے۔ کل رات بحران میں بڑبڑانے لگا۔ "میری امی کہاں ہے۔ میری امی کہاں ہے —" اور میں اس کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ رو رو کر میرا بُرا حال ہو گیا مگر اس کے باپ کی آنکھیں نہ پسیجیں۔

پریم : کیا یہ ضروری ہے کہ انسان رو کر ہی اپنی ہمدردی جتائے؟

دمینتی : تم ہمیشہ شیکھر کی حمایت کیوں کرتے ہو؟ تم مرد لوگ کبھی عورت کے نہیں بنتے۔ عورت چاہے تمہاری بننے کے لیے لاکھ بار مِٹ جائے۔ (آنکھوں میں آنسو بھر لاتی ہے)۔

پریم : میرا مطلب یہ نہیں تھا دمّی — میں نے تو یوں ہی بات کہہ دی تھی۔

چیتن : (اندر کمرے میں سے) امّی !

دمینتی : آئی بیٹا —

پریم : اصل میں بچّے کی بیماری کی وجہ سے تم گھبرائی ہوئی ہو اور غصّہ مجھ پر انڈیل رہی ہو۔

دمینتی : (آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھیں ہنسنے لگتی ہیں) پریم تم بہت ظالم ہو۔ میں جو بات کہتی ہوں اس کو تم نفسیاتی نشتر سے چھیل کر مٹی میں ملا دیتے ہو۔

پریم : میں نے اپنی سولہ سال کی تعلیم سے یہی فائدہ اٹھایا ہے۔

دمینتی : آج موسم کتنا پیارا ہے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہلکی ہوا چل رہی ہے اور بادل اُمڈ کر آتے ہیں اور

نیچے جھک کر چلے جاتے ہیں — میں تو سرچتی ہوں ....

(بولتے بولتے چپ ہو جاتی ہے جیسے کسی سردر میں ڈوب گئی ہو)

پریم : تم کیا سوچ رہی ہو؟

دمینتی : کمبخت چیتن کو ان ہی دنوں بیمار ہونا تھا۔

پریم : پھر کیا ہوا۔ اچھا ہو جائے گا — ماں کو اپنی ممتا کے اظہار کا موقع دے رہا ہے۔

دمینتی : "آجکل ساون کی رم جھم کے دن ہیں !
آجکل بادل چھاجوں برس رہے ہیں !
آجکل ہوائیں زور زور سے آ رہی ہیں !
آجکل ہوائیں بہت دُور جا رہی ہیں !
آجکل ہوائیں بھینی بھینی خوشبو سے
اُس میں تیرے سانسوں کی سی مہک ہے!"

(دونوں کو یہ شعر اچھے لگتے ہیں اور وہ خاموش ہو جاتے ہیں)

پریم : شیکھر جی ابھی تک نہیں آئے۔

دمینتی : آتا ہی ہوگا — بیٹے کے پاس بیٹھنے کی میری ڈیوٹی ختم ہونے والی ہے۔ باقی دن شیکھر بیٹھے گا — پھر آدھی رات میں — اور آدھی رات شیکھر۔

پریم : تم لوگوں نے نہ جانے کیسے زندگی کو ایک مشین بنا لیا ہے — مجھے تو کبھی کبھی تم سے ڈر لگتا ہے۔

دمینتی : اس میں ڈر کی کیا بات ہے — ہر روز کی جھک جھک، ہر روز کی چیخ پٹخ، ہر روز کی بدمزگی سے کیا یہ اچھا نہیں ہے کہ آدمی کوئی سمجھوتہ کرے —

پریم : تمہارے اس امن کے سمجھوتہ کی کیا شرائط ہیں ؟

دمینتی : پڑھے لکھے، سمجھدار نئی روشنی کے لوگوں کی طرح ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ مرد کو جتنا حق جس طرح بھی جینے کا ہے اتنا ہی حق اُسی طرح جینے کا عورت کو بھی حاصل ہے —

پریم : اگر مرد غلطی کرے تو کیا عورت کو بھی ناپ تول کر اُتنی ہی غلطی کرنی چاہیے ؟

دمینتی : اس کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے مگر ہمارا فیصلہ یہ ہے کہ جس طرح وہ چاہے اپنی زندگی بسر کر سکتا ہے اور جس طرح میں چاہوں اپنا دل خوش کر سکتی ہوں — اسے میری نجی زندگی سے کوئی واسطہ نہیں اور مجھے اس کی نجی زندگی سے کوئی سروکار نہیں۔

پریم : ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ مجھے ابھی بہت کچھ سیکھنا ہے ۔
دمینتی : اس سمجھوتہ کا فائدہ یہ ہوا ہے کہ اس گھر میں اب برتن ٹوٹنے بند ہو گئے ہیں کوئی ایک دوسرے کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر نہیں دیکھتا۔ کوئی کُرید کُرید کر کسی کے دل کا بھید جاننے کی کوشش نہیں کرتا۔ اس گھر میں اب کسی نے اونچی آواز نہیں سنی ۔
پریم : ایک خاموشی قبرستان کی خاموشی ہوتی ہے —!
دمینتی : نہیں۔ یہ خاموشی رات کی خاموشی ہے ۔
پریم : رات کے اندھیرے کی خاموشی !
دمینتی : نہیں۔ رات کے پردے کی خاموشی جس کی اوٹ میں بچھڑے ہوئے ملتے ہیں — لاکھوں آرزوئیں پوری ہوتی ہیں ۔
پریم : نقب زنی کی صورت میں۔ چوریوں کی صورت میں — رہزنی کی شکل میں — ڈاکے کی صورت میں ؟
دمینتی : آج تم کیسی باتیں کر رہے ہو ؟
پریم : (ہنستے ہوئے) جیسی مرد عورت سے باتیں کرتا ہے ۔
دمینتی : غلام عورت سے ؟
پریم : اپنی محبوبہ سے — اپنی بیوی سے — اپنے بچے کی ماں سے —
دمینتی : پریم — تم جیسے آقا کے لیے میں غلام بننے کو بھی تیار رہوں۔ آہ۔ وہ دن کب آئے گا ؟
پریم : اکثر کسی کے سپنے کی دنیا ایک ہاتھ کے فاصلے پر ہوتی ہے لیکن کوئی اس تک ہاتھ نہیں بڑھاتا۔
(پریم سگریٹ پہ سگریٹ پیئے جا رہا ہے۔)
دمینتی : آہ — میری مجبوریاں !
پریم : شیکھر سے تمہارا سمجھوتہ ہو گیا ہے۔ سارا شہر ہماری محبت سے بھی واقف ہے شیکھر اور حسنہ کے تعلقات کا بھی چرچا ہے — اب تمہیں اور کون سی مجبوری ہے — ؟
دمینتی : میری سب سے بڑی مجبوری میرا بچہ ہے۔ اپنے بچے سے اس کے باپ کو چھیننے کا مجھے کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ کاش ! وہ تمہیں کبھی شیکھر دیکھنے لگے ۔
(چیتن کمزوری سے لڑکھڑاتا ہوا آہستہ سے اپنے کمرے سے باہر آجاتا ہے)
چیتن : امی ۔

دمینتی : (ایک دم گھبرا کر) ہائے ۔میرے بچّے ۔۔۔تم پلنگ پر سے کیوں اُٹھے ؟

(چیتن کو ماں گود میں لے لیتی ہے۔ پریم سامنے صوفے پر جا بیٹھتا ہے)

پریم : اسے یوں باہر نہیں آنا چاہیے تھا ۔

دمینتی : کوئی بات نہیں۔

پریم : کہتے ہیں کہ میعادی بخار میں مریض کو چارپائی پر سے نہیں اٹھنا چاہیے ۔

دمینتی : ان ڈاکٹروں کا بھی کچھ پتہ نہیں چلتا۔ کبھی کہتے تھے کہ اس بخار میں کچھ کھانا نہیں چاہیے۔ اب کہتے ہیں کہ مریض کا دل چاہے تو وہ تندوری روٹی کھا سکتا ہے ۔

پریم : (بچے پر نظر ڈال کر) گود میں لیٹتے ہی سو گیا ہے ۔

دمینتی : (بچے کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے) یہ میری جان ہے ۔۔ ایک چھوٹی سی کھونٹی جس سے میں سر تا پا بندھی ہوئی ہوں ۔۔۔ اگر یہ نہ ہوتا تو میں چڑیا کی طرح اڑ کر تمہارے ساتھ چلی جاتی ۔

پریم : کیسے سو رہا ہے ۔۔۔ بخار تو تیز نہیں ہو گیا ؟ ممتا کی ٹھنڈی گود میں ماں کو بچّے کا بخار اکثر محسوس نہیں ہوتا ۔

دمینتی : پریم۔ میں سوچتی ہوں ۔ میرے اور سکھ کے درمیان اگر چیتن نہ ہو تو پھر ہم دونوں کا رشتہ ہی کیا رہ جاتا ہے ۔ایک معاہدہ جسے پلک جھپکتے ہی ٹھکرایا جا سکتا ہے ۔ دو پنچھی ایک شاخ پر آ بیٹھتے ہیں۔ دو مسافر ایک پڑاؤ پر ستا لیتے ہیں ۔ دو پرچھائیاں ایک روشنی میں مل جاتی ہیں ، بچھڑ جاتی ہیں اگر دل نہ ملیں تو پھر باقی سارے ملاپ جھوٹے ہیں

آیا : (دروازے میں سے روما کو اندر کھینچتے ہوئے) نمستے بی بی جی ۔ چیتن کا کیا حال ہے ۔۔؟ ہماری بے بی ہر وقت چیتن چیتن پکارتی رہتی ہے ۔ اِن کا آپس میں بڑا میل ہے ۔

دمینتی : ارے روما ۔۔۔ آجا بیٹی ۔۔۔

پریم : چیتن ۔

دمینتی : چیتن بیٹا دیکھ کون آئی ہے ۔۔۔؟

(چیتن آنکھیں کھولتا ہے اور روما کو دیکھ کر اس کے چہرے پر تبسّم کھیلنے لگتا ہے)

دمینتی : بچّہ کھِل اٹھا ہے ۔

پریم : اسے محبّت کہتے ہیں۔ محبّت مردہ جسم میں رُوح پھونک سکتی ہے۔
دمینتی : میں اسے اس کے کمرے میں لٹا کر آتی ہوں۔ آیا، تم اس کے پاس بیٹھنا۔

(دمینتی ساتھ کے کمرے میں چیتن کو لٹا کر آتی ہے۔ آیا اور روما بھی اُسی کمرے میں چلی جاتی ہیں۔)

پریم : یہ وہی آیا ہے نا جس کی تمہارے راموسے بڑی دوستی تھی!
دمینتی : (پھر پریم کے پاس بیٹھتے ہوئے) ہاں۔ راموکی بیوی بڑی چڑیل ہے۔ اس نے ان کی دال نہیں گلنے دی۔
پریم : آج کل ان دونوں کا کیا حال ہے؟
دمینتی : بیچاری ڈر کے مارے اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھتی۔ کوٹھی میں بچّی کو گھما کر واپس لے جاتی ہے۔ کیا مجال جو نوکروں کے کوارٹروں میں کبھی جھانک بھی سکے۔ راموکی بیوی اس کا خون پی جائے جتنی دیر تک یہ ادھر رہتی ہے راموبھی کوٹھی میں نہیں آتا۔
پریم : سچ!
دمینتی : مجھے یاد ہے۔ ایک چاندرات کو میں نے کھڑکی میں سے باہر جھانک کر دیکھا — باغیچے میں آیا سرو کے پیڑ کے پاس کھڑی راموکا انتظار کر رہی تھی — اور ادھر راموبڑی تیزی سے کام نپٹا رہا تھا۔ اُس رات پریم تم مجھے بہت یاد آئے۔ میں نے ساری رات آنکھوں میں کاٹ دی۔ مجھے بار بار یوں محسوس ہوتا جیسے میں سرو کے پاس کھڑی انتظار کیے جارہی ہوں مگر تمہارا کام ختم نہ ہوا۔
پریم : یہ تو بتاؤ کہ ان کے عشق کا کیا بنا؟
دمینتی : عشق ختم ہوگیا — میں تو یہ مانتی ہوں کہ عشق بھی عقل سے ہوتا ہے۔ پیسے سے ہوتا ہے۔
پریم : اور عمر کے ساتھ ہوتا ہے۔

(باہر باغیچے میں سے ایک عورت کے چیخنے کی آواز آتی ہے۔ رامو اپنی بیوی کو پیٹ رہا ہوتا ہے)

آیا : (تڑپتے ہوئے) ہائے — بی بی جی۔ مار ڈالے گا (چیختے ہوئے) کھڑکی میں دیکھیے کس طرح مار رہا ہے۔
پریم : آیا۔ چپ رہو!
دمینتی : آہستہ بات کرو آیا۔ بچّہ بیمار ہے۔

(باہر سے مارپیٹ کی آواز ابھی تک آ رہی ہے)

آیا : (مچھلی کی طرح تڑپتے ہوئے) بی بی جی۔ دیکھیے تو سہی۔ قصائی کی طرح مار رہا ہے۔

پریم : ہوا کیا ہے ؟

دمینتی : کون کس کو مار رہا ہے ــــ؟

آیا : (ہاتھ ملتے ہوئے) رامو مار رہا ہے بی بی جی۔ اپنی بیوی سنتی کو ــــــ

پریم : پھر تجھے کیا ؟

آیا : (آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں) ہائے۔ کس طرح چیخ رہی ہے ــــ واویلا کر رہی ہے بی بی جی اسے چھڑا دیجیے۔ جہاں جی میں آتا ہے مکّے اور لاتیں مار رہا ہے۔ جگہ بے جگہ مارے جا رہا ہے۔

(پریم اور دمینتی آیا کے پاس جا کر کھڑکی میں سے باہر دیکھتے ہیں۔ باہر سے رونے کی آواز آتی جا رہی ہے۔)

دمینتی : وحشیوں کی طرح مار رہا ہے۔ رامو پر جیسے بھوت سوار ہو۔

آیا : ہائے۔ بی بی جی۔ آپ جا کر اسے چھڑا دیجیے۔ بھگوان کرے آپ کی جوڑی سلامت رہے۔

(پریم اور دمینتی یہ سن کر ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے ہیں اور دمینتی باہر چلی جاتی ہے۔)

پریم : یہ اُسے کیوں مار رہا ہے ــــ؟

آیا : میں کھڑکی میں سے دیکھ رہی تھی ــــ رامو کی بیوی مالی کے بھائی سے باتیں کر رہی تھی۔ رامو اوپر سے آیا اور اس کو پیٹنے لگا۔

(باہر شور بند ہو جاتا ہے)

پریم : آیا۔ تو تجھے اس سے کیا واسطہ ــــ رامو کی بیوی تو تم سے ہمیشہ لڑتی رہتی ہے۔

آیا : عورت ذات ہے صاحب ــــ بچے کی ماں کو مارنا ٹھیک نہیں۔

پریم : رامو کی بیوی اور مالی کا بھائی کیا فقط باتیں ہی کر رہے تھے ؟

آیا : باتوں باتوں میں اس کا دوپٹہ سر سے ڈھلک گیا تھا۔ رامو نے آ کے اُس کی چوٹی پکڑ لی اور اسے گھسیٹنا شروع کر دیا۔ کیا کبھی ایسا بھی ہوا ہے۔ (کمرے کے اندر دیکھتے ہوئے) ہائے رام میرے بچے کیسے سہمے ہوئے ہیں۔

(باہر چلی جاتی ہے)

دمینتی : (کمرے میں آکر) بیر راموا پنی بیوی سے کانپتا تھا — آج شیر کی طرح دھاڑ رہا ہے۔
پریم : طاقت بدن میں نہیں ہوتی۔ طاقت سچ میں ہوتی ہے۔ جو آدمی سچا ہے وہی طاقتور ہے۔
دمینتی : تمہاری فلاسفی میری سمجھ میں نہیں آتی۔ میری نظر میں تو جو چیز خوبصورت ہے وہی سچی ہے۔
پریم : خیر — یہ ایک لمبی بحث ہے — یہ بتاؤ — کیا میرے جانے کا وقت نہیں ہوا؟
دمینتی : (گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے) ہاں۔ پریم۔ اب تم جاؤ — میں آدھ گھنٹے میں تم سے ملوں گی۔
پریم : (مسکراتے ہوئے) بچے کی طبیعت تو روما نے ٹھیک کر دی ہے۔
دمینتی : پھر نو بجے سے میری ڈیوٹی شروع ہو جائے گی۔ آج لیٹ نائٹ شیکھر اور حسنہ کی ہے۔

(دونوں مسکراتے ہیں۔ پریم چلا جاتا ہے۔ دمینتی اُسے پیار بھری نظروں سے دیکھتی رہتی ہے۔)

آیا : (روما کو انگلی سے پکڑے ہوئے آتی ہے۔) اچھا بی بی جی۔ ہم جا رہے ہیں۔ چیتن سو گیا ہے۔
روما : جب چیتن جاگے تو مجھے بلا لینا آنٹی جی! میں آج اس کے پاس ہی رہوں گی۔
آیا : روما کا ہاتھ چیتن نے پکڑے رکھا اور باتیں کرتا ہوا سو گیا۔

(باہر موٹر کی آواز)

روما : چیتن کے ڈیڈی آئے ہیں۔
آیا : تجھے کیسے پتہ چلا روما؟
روما : میں ان کی موٹر کا ہارن پہچانتی ہوں۔
آیا : (جاتے ہوئے) اچھا بی بی جی نمستے۔
روما : نمستے آنٹی جی۔
دمینتی : نمستے بیٹی۔
روما : (جاتے ہوئے) آنٹی جی چیتن جاگے تو مجھے ضرور بلا لیجیے گا۔
شیکھر : (کمرے میں آکر) ہیلو۔
دمینتی : آپ نے روما کی فرمائش سنی؟
شیکھر : سن لی۔ سن لی۔ مرد کا کام ہی کیا ہے۔ عورت کی فرمائش سنتے رہنا یا عورت کی فرمائش پوری کرتے رہنا۔
دمینتی : اچھا تو ایک فرمائش اور ہے۔ جناب بچے کے پاس ڈیوٹی دیجیے۔ اور میں تیار ہو جاؤں۔

شیکھر : (گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے) بہت اچھا۔ بہت اچھا۔
دمینتی : (سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جاتے ہوئے) چیتن سو رہا ہے۔ اس کی طبیعت بہتر ہے۔
شیکھر : بہت اچھا۔ بہت اچھا۔
(شیکھر صوفے پر بیٹھتا ہی ہے کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے لگتی ہے۔)
شیکھر : ہیلو...... ہاں حُسنہ ـــ تم ابھی وہاں سے چلی نہیں۔ آدھے گھنٹے تک آجاؤ ـــ میں موٹر بھجوائے دیتا ہوں ..... تم اس مول ہنگی نہیں ہو۔
(ہنستے ہوئے رسیور کریڈل پر رکھ دیتا ہے اور بجلی کی گھنٹی کا بٹن دوبار دباتا ہے۔)
رامو : (کمرے میں آکر) نمستے صاحب۔
شیکھر : رامو ـــ میں نے کتنی گھنٹیاں بجائی تھیں ؟
رامو : جی ـــ دو۔
شیکھر : دو گھنٹیوں کا کیا مطلب ہوتا ہے ؟
رامو : کہ ڈرائیور آئے ـــــ
شیکھر : تو پھر تم کیوں آئے ؟
رامو : صاحب ـــ آج تو میرا دماغ خراب ہو رہا ہے۔
شیکھر : کیا ہوا تمہیں ؟ تو نے یہ کیا حال بنا رکھا ہے ؟
رامو : (رونے لگتا ہے) صاحب ـــ یہ مالی کا غنڈہ بھائی میری بیوی کو بھگا لے جائے گا۔
شیکھر : اگر وہ جانا چاہتی ہے تو تم کیوں روکتے ہو ؟ جانے دو ـــ دوسری کو ـــــ
رامو : نہ صاحب ـــ میں برباد ہو جاؤں گا۔
شیکھر : جو عورت تمہاری وفادار نہیں ـــ تم اس کے لیے کیوں مرتے ہو ؟
رامو : نہ صاحب ـــ میں تو اس کی ٹانگیں توڑ دوں گا ـــ مجھے چھوڑ کر وہ کیسے جا سکتی ہے۔
(باہر موٹر کی آواز)
شیکھر : اچھا ـ میں مالی کو بلا کر سمجھاؤں گا ـــ تم جاؤ اور ڈرائیور سے کہو کہ وہ حُسنہ بی بی کے ہوسٹل چلا جائے۔ اور یہ بھی دیکھو کہ باہر کون آیا ہے۔
کیلاش اور کملا : (کمرے میں آکر) ہیلو۔

شیکھر : ہیلو۔ آئیے ۔آئیے۔تم نے شادی کیا کی — عید کے چاند ہو گئے۔
کیلاش: کچھ نہ پوچھو۔ ہمیں یہ شادی بہت مہنگی پڑی ہے ۔
شیکھر : ٹھیک ہے ۔ٹھیک ہے۔ سستا روئے بار بار مہنگا روئے ایک بار —
کملا : آپ تو گھاٹے میں نہیں رہے —
کیلاش: کچھ نہ پوچھو۔کبھی یہ رسم — کبھی وہ رسم۔
شیکھر : ہمارے دیش میں شادی کے بعد کم سے کم ایک سال آدمی کو باقی سب کام چھوڑ کر شادی کے چکّر میں رہنا پڑتا ہے —
کیلاش: کوئی تک بھی ہو — بابا — میں تو تھک گیا۔
شیکھر : کملا کی طرف دیکھو۔کہنیوں تک چوڑیاں پہنے ہوئے ہے۔
دمینتی : (بنی سنوری سیڑھیوں پر سے اترتی ہے) ہیلو۔
کیلاش اور کملا : ہیلو۔ہیلو۔

(سب اٹھ کر ملتے ہیں)

دمینتی : کملا — تیری بالیاں کتنی پیاری ہیں ۔تجھے بہت سج رہی ہیں۔بمبئی سے منگوائی ہوں گی۔ اس منحوس شہر میں تو کچھ ملتا ہی نہیں ہے۔ میں تو اکثر سوچتی ہوں کہ سال میں آدمی کو ایک بار بمبئی ضرور جانا چاہیے — یا آدمی بمبئی جائے یا کلکتہ — یہ شہر تو اتنا پرانا ہے جیسے کوئی گاؤں ہو۔افسروں کی بیویاں۔کلرکوں جیسی ذہنیت ۔ایک ایک پیسے پر جان دیتی ہیں ۔
کیلاش: معاف کیجیے گا — ہم جس کام سے آئے تھے پہلے وہ تو پوچھ لیں ۔
کملا : ہاں سچ ۔جیتن کی طبیعت کیسی ہے ؟
دمینتی : آج تو بہتر ہے۔ چل کر یہاں تک آگیا تھا ۔ اپنی دوست روما سے کھلکھلا کر ہنستا رہا، باتیں کرتا رہا۔
کیلاش: بھگوان کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ آج کل بہت بُری وبا پھیلی ہوئی ہے — میں نے سنا تو میری جان ہی نکل گئی ۔
کملا : کیسا بخار ہے —؟
شیکھر : ڈاکٹروں کو ابھی تک پتہ نہیں چل سکا۔
کملا : تو پھر علاج کس بیماری کا ہو رہا ہے ؟

شیکھر : پہلے بتاتے رہے کہ گلا خراب ہے ۔پنسلین کے ٹیکے لگاتے رہے ۔ پھر ملیریا کے ٹیکے لگاتے رہے ۔ اور اب ٹائیفائڈ کی دوا دے رہے ہیں ۔

دمینتی : ہمارے بچے پر تو پنسلین کا اثر ہی نہیں ہوتا ۔ بچپن سے اسے اتنی پنسلین ملی ہے کہ اب اس پر کوئی اثر نہیں کرتی ۔

شیکھر : چلو ۔ جیسے بھی ہوا ۔ بخار تو کم ہو گیا ۔

(ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے لگتی ہے ۔ دمینتی اُٹھ کر سُنتی ہے)

دمینتی : ہیلو..... ہاں میں بول رہی ہوں ..... بس آرہی ہوں ۔ پانچ منٹ میں پہنچ جاؤں گی ۔

(رسیور کریڈل پر رکھ دیتی ہے ۔)

کیلاش : اچھا تو ہم بھی ان کے ساتھ چلتے ہیں ۔

کملا : ہاں — یہ ٹھیک ہے ۔

دمینتی : تم بیٹھو — چائے پیو —

کیلاش : نہیں، ہم ذرا جلدی میں ہیں ۔

کملا : گھر واپس جا کر ہمیں کہیں اور بھی جانا ہے ۔

دمینتی : اچھا میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑتی جاؤں گی ۔ میں کلب جا رہی ہوں ۔

(شیکھر سے ہاتھ ملا کر مہمان دمینتی کے ہمراہ باہر چلے جاتے ہیں ۔)

شیکھر : (پکارتے ہوئے) رامو —

رامو : جی صاحب ۔

شیکھر : رامو تم کیا کر رہے ہو ؟

رامو : صاحب ۔ میں چیتن کا کمرہ ٹھیک کر رہا تھا

شیکھر : اچھا خانساماں سے چائے کے لیے کہو ۔

رامو : مجھے تو ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ چیتن کا بخار زیادہ تیز ہو گیا ہے ۔

شیکھر : نہیں ۔ آج تو آرام ہے ۔ ہنستا رہا ہے ۔ کھیلتا رہا ہے ۔ کمرے میں دوڑتا رہا ہے ۔

(باہر موٹر کی آواز)

رامو : اچھا میں چائے کا انتظام کرتا ہوں ۔

شیکھر : ذرا جلدی ۔

(غرارہ پہنے ہوئے، پھولوں اور گجروں سے سجی ہوئی حُسنہ آتی ہے۔)

حُسنہ: ہیلو ــــ

شیکھر: ہیلو حُسنہ ــــ (دونوں ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر مسکراتے ہوئے ملتے ہیں اور پھر پاس پاس بیٹھ جاتے ہیں۔)

حسنہ: تم کب آئے ؟

شیکھر: مجھے آج دفتر میں کچھ دیر ہو گئی۔ وہیں سے میں کلب چلا گیا۔ میں نے سوچا کہ چیتن کی طبیعت نہ جانے کیسی ہے۔ کلب میں نہا کر وسکی کا آدھا پیگ پیا اور گھر چلا آیا۔ راستے میں تمہارے ہوسٹل کے قریب سے گزرا۔ بھینی بھینی خوشبو آرہی تھی۔ میں نے سوچا تم ضرور اندر ہوگی۔

(دونوں ہنسنے لگتے ہیں)

حسنہ: اچھا۔ چیتن کا کیا حال ہے ؟

شیکھر: ٹھیک ہے۔ بالکل مزے میں ہے۔ آج ہی اس کی ماں دن میں اس کے پاس رہی اور آج ہی اس کی طبیعت سنبھل گئی۔

حسنہ: پھر تو اس خوشی میں دعوت ہو جائے۔

شیکھر: میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔

حسنہ: چیتن کہاں ہے ؟

شیکھر: سو رہا ہے۔ کیوں ؟

حسنہ: میں سوچ رہی تھی کہ اگر وہ جاگ رہا ہوتا تو میں اس کے پاس بیٹھتی۔ یہ بڑا ضروری ہے شیکھر کہ بچّہ کم سے کم مجھے پرائی سمجھنا تو چھوڑ دے۔

شیکھر: ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ سب ہو جائے گا۔

حسنہ: ٹھیک کیسے ہے؟ ابھی تو وہ مجھ سے سیدھے مُنہ بات نہیں کرتا۔ میں اُسے لاکھ لالچ دے چکی ہوں ــــ لاکھ لاڈ چاؤ کر چکی ہوں ــــ

شیکھر: حسنہ۔ تم کوئی غم نہ کرو۔ تمہارا کام زندگی میں صرف حُسن پیدا کرنا ہے اور بس۔ ــــ

حسنہ: تو پھر تم کوئی حسین بُت کیوں نہیں رکھ لیتے۔ انسان کا حسن تو ماند پڑ سکتا ہے، مرجھا سکتا ہے، بکھر سکتا ہے۔ پتھر کے بُت کا حسن ہمیشہ نیا، تازہ اور جوں کا توں رہتا ہے۔

رامو: (باہر سے) صاحب۔

شیکھر : کیوں رامو ؟
حسنہ : اندر آجاؤ۔
رامو : صاحب!
شیکھر : اگر چائے تیار نہ ہو تو وِسکی لے آؤ۔
رامو : صاحب ــــ مجھے تو چیتن کا بخار تیز معلوم ہوتا ہے۔
حسنہ : ہیں۔
رامو : مجھے تو یوں لگ رہا ہے کہ چیتن پر بخار کی تیزی سے بحرانی کیفیت طاری ہے۔
شیکھر : میں جاکر دیکھتا ہوں۔

(حسنہ اور شیکھر ساتھ کے کمرے میں جاتے ہیں۔)

رامو : (ہاتھ جوڑتے ہوئے) اے بھگوان ـــــ تو ہمارے چیتن کا سہارا ہے۔ تو ہی اس معصوم کا نگہبان ہے ــ اے بھگوان اس بچے کو بچالے ــ تو اس بچے کو بچائے بھگوان ـــــ اے بھگوان ــ اے بھگوان ـــ اے بھگوان ـــــ!

(رامو ایک کونے میں پڑی بھگوان کرشن کی تصویر کے آگے آنکھیں بند کیے ہوئے پرارتھنا کرتا رہتا ہے۔)

شیکھر : (گھبرایا ہوا آکر ٹیلیفون کرتا ہے) ڈاکٹر صاحب۔ میں شیکھر بول رہا ہوں ـــــ چیتن کی طبیعت سخت خراب ہے ــ کیا آپ فوراً آسکتے ہیں...... شکریہ۔

(رسیور کریڈل پر رکھ کر دوسرے کمرے میں چیتن کے پاس چلا جاتا ہے)

حسنہ : (کمرے میں آکر) رامو۔ تم یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو۔ برف لاکر بچے کے ماتھے پر رکھو۔
رامو : (روتے ہوئے) یہ وقت بھگوان کو یاد کرنے کا ہے میم صاحب۔ میں بھگوان سے چیتن کی زندگی کی بھیک مانگ رہا ہوں۔ (پرارتھنا جاری رکھتا ہے)
حسنہ : رامو۔ تم پگلے ہی رہے۔ میں خود جاکر برف لاتی ہوں۔

(حسنہ تیز تیز قدم رکھتی ہوئی سامنے کے دروازے میں سے نکل جاتی ہے)

رامو : (پرارتھنا کرتے ہوئے) اے بھگوان اس بچے کو کچھ نہ ہو۔ یہ گھر برباد ہو جائے گا اے بھگوان! اے ایشور ــ اے بنسری والے ـــــ!
حسنہ : (برف لے کر آتے ہوئے) رامو۔ تم ابھی تک وہاں کھڑے منمنا رہے ہو۔

(بیمار بچّے کے کمرے میں جاتی ہے)

شیکھر : (کمرے میں آکر) رامو — تم یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو؟ اندر جاکر حسنہ بی بی کی مدد کرو۔

رامو : صاحب۔ یہ گھڑی ایشور سے مدد مانگنے کی ہے۔ چیتن تو ہاتھوں سے جا رہا ہے —
(روتے ہوئے) اے بھگوان۔ اس بچّے کا بال بانکا نہ ہو۔

شیکھر : (ٹیلیفون کا نمبر ملا کر) میٹرو کلب —؟...... مسز شیکھر ہوں گی۔ ان کو ذرا ٹیلیفون پر بلا دیجیے ..... وہ چلی گئیں !.... کب ..... ابھی .....

(رسیور کریڈل پر رکھ دیتا ہے۔ باہر ڈاکٹر کی موٹر آتی ہے۔ ڈاکٹر تیزی سے کمرے میں داخل ہوتا ہے۔)

شیکھر : ڈاکٹر صاحب۔ ابھی اچھا بھلا تھا۔ ایک دم بخار تیز ہو گیا۔ بس بے سُدھ پڑا ہے —
(دونوں بیمار بچّے کے کمرے میں جاتے ہیں۔)

رامو : (پرارتھنا کرتے ہوئے) اے بھگوان — یہ گھر برباد ہو جائے گا — اگر یہ بچّہ تو نے اٹھا لیا تو اے بھگوان اس گھر کی ایک اینٹ بھی باقی نہیں بچے گی۔

حسنہ : (آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے آتی ہے) رامو — تمہیں صاحب بلا رہے ہیں۔

رامو : (دوسرے کمرے میں جاتے ہوئے) اچھا بی بی جی۔

(حسنہ کی آنکھوں سے آنسو چھلک آتے ہیں اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے۔)

حسنہ : نہیں نہیں۔ ایسا کبھی نہیں ہو گا — چیتن کو کچھ نہ ہو۔

(وہ اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے صوفے پر بیٹھ جاتی ہے۔ روتی بھی جا رہی ہے اور ایک ایک کر کے پھولوں کے گہنے پاس پڑے ہوئے میز پر رکھتی جا رہی ہے۔)

شیکھر : (کمرے میں آکر ٹیلیفون کا نمبر گھماتے ہوئے) ہیلو — سول سرجن صاحب۔ جی، میں شیکھر بول رہا ہوں — ہمارے بچّے کی طبیعت بہت خراب ہے۔ ڈاکٹر کپور آئے ہوئے ہیں۔ وہ آپ سے مشورہ کرنا چاہتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب۔ بھگوان کے لیے جلدی آئیے گا۔ میرا بچّہ میرے ہاتھوں سے جا رہا ہے۔

حسنہ : (آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے اٹھتی ہے اور شیکھر کی طرف دیکھتی ہے) شیکھر —

(گھبرایا ہوا تسیکھر حسنہ پر توجہ کیے بغیر چلا جاتا ہے)

رامو : (گھبرایا ہوا آتا ہے) رام ۔ رام ۔ رام ۔ رام ۔ رام ۔
(یوں جاپ کرتا ہوا باہر چلا جاتا ہے)

شیکھر : (پھر ٹیلیفون کرنے کے لیے آتا ہے) کیا ڈاکٹر آہوجہ بول رہے ہیں ۔ ڈاکٹر صاحب میں شیکھر بول رہا ہوں ۔ میرا بچّہ بے سُدھ پڑا ہے ۔ ڈاکٹر کپور آپ کو مشورے کے لیے بلا رہے ہیں ۔ سول سرجن صاحب بھی آ رہے ہیں ۔ ڈاکٹر صاحب ۔ ذرا جلدی ۔ بھگوان کے لیے ۔

حسنہ : (آنکھوں میں آنسو لیے اُسی طرح تسیکھر کی طرف دیکھتی رہتی ہے ۔) تسیکھر ۔ میری جان !
(پریشانی میں غلطاں شیکھر پھر حسنہ پر توجہ کیے بغیر چلا جاتا ہے)

حسنہ : (اپنے آپ سے) مجھے اس گھر سے چلے جانا چاہیے ۔

رامو : (ایک چلمچی لیے ہوئے آتا ہے) رام ۔ رام ۔ رام ۔ رام ۔
(جاپ کرتا ہوا چلا جاتا ہے)

حسنہ : مجھے اب اس سے چلے جانا چاہیے ۔

آیا : (گھبرائی ہوئی آتی ہے) مجھے تو اس وقت بھی محسوس ہو رہا تھا کہ چیتن بخار میں بے سدھ ہے ۔
(وہ ہاتھ ملتے ہوئے بیمار کے کمرے میں چلی جاتی ہے ۔)

حسنہ : (اپنے آپ سے) اس گھر میں میری کیا جگہ ہے ـــ مجھے اب چلے جانا چاہیے ۔
(رو ما تیز تیز گھبرائی ہوئی آتی ہے اور چیتن کے کمرے میں چلی جاتی ہے ۔)

حسنہ : (آنکھوں میں آنسو بھر کر اپنے آپ سے) اس گھر میں رامو کے لیے جگہ ہے ۔ مگر میرے لیے کوئی جگہ نہیں ۔ اس گھر میں پڑوسیوں کی آیا کے لیے جگہ ہے ۔ مگر میری کوئی اہمیت نہیں ۔ آخر میں اس بچّے کی کیا لگتی ہوں ـــ میں اس بچّے کے باپ کی بھی کیا لگتی ہوں ۔ ـــ شاید میں اِس دکھ میں اس کے گناہ یاد دلا رہی ہوں ـــ میری اس گھر میں کوئی جگہ نہیں ، میری اِس گھر میں کوئی جگہ نہیں ۔ میری اس گھر میں کوئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
(وہ اپنے آپ سے یوں باتیں کرتی ہوئی باہر چلی جاتی ہے)

رامو : (تیز تیز گزرتے ہوئے) رام ۔ رام ۔ رام ۔ رام ۔ رام ۔ رام ۔

آیا : (روما کے ساتھ جاتے ہوئے) چلو بچّی ـــ تمہارے چیتن کی طبیعت آج ٹھیک نہیں ہے۔

روما : چیتن بیہوش کیوں پڑا ہے ـــ؟

آیا : بیہوش نہیں بیٹی ـــ وہ تو سویا ہوا ہے۔

روما : آیا۔ تم بوڑھی ہوگئی ہو ـــ تمہیں کچھ خبر نہیں۔ وہ بیہوش ہے۔

آیا : اچھا بچّی۔ تو جو کہتی ہے، ٹھیک ہے۔ آج کل کے بچّے..... تم سے کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی۔

(دونوں باہر چلی جاتی ہیں)

دمینتی : (رامو کے ساتھ آتے ہوئے) میں ہوٹل میں بیٹھی چائے پی رہی تھی۔ اچانک جیسے کسی نے میرے کلیجہ پہ ہاتھ ڈال دیا۔ میں چائے ویسی کی ویسی چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

رامو : یہ ماں کا دل ہے ـــ

دمینتی : اے بھگوان ـــ میرے بچّے کو کچھ نہ ہو۔

رامو : اے ایشور ـــ تو ہمارے چیتن کا رکشک ہے۔

(بیمار بچّے کے کمرے میں چلے جاتے ہیں۔ ان کے جاتے ہی ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے لگتی ہے۔ کچھ دیر کے لیے گھنٹی بجتی رہتی ہے۔)

رامو : (کمرے میں آکر ٹیلیفون سنتے ہوئے) ہیلو..... ہاں جی، بی بی جی ہیں۔ ابھی بلائے دیتا ہوں ـــ

(رسیور رکھ کر رامو جاتا ہے۔ کچھ دیر کے لیے رسیور یوں ہی پڑا رہتا ہے۔)

دمینتی : (کمرے میں آکر رسیور اٹھاتے ہوئے) ہیلو۔ پریم۔ میرے بچّے کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔

(یہ کہہ کر ایک دم رسیور کریڈل پر رکھ دیتی ہے۔)

شیکھر : (کمرے میں آکر) دمّی ـــ تمہیں ٹیلیفون یوں بند نہیں کرنا چاہیے تھا۔

(دمینتی نم آلود آنکھوں سے اپنے شوہر کی طرف دیکھتی ہے اور ادھر سے کمرے میں جانے کے لیے قدم اٹھاتی ہے۔)

شیکھر : ڈاکٹر نے کہا ہے کہ ہم تھوڑی دیر کے لیے باہر رہیں۔

(دمینتی پریشان ہے ۔۔۔ اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگتے ہیں)

شیکھر : دمّی ۔۔۔ تمہیں ٹیلیفون یوں بند نہیں کرنا چاہیے تھا۔

(دونوں کچھ دیر تک چپ کھڑے رہتے ہیں۔)

رامو : (کمرے میں آکر) صاحب جیتن نے آنکھیں کھول دی ہیں۔

دمینتی : اے بھگوان۔ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ اے ایشور۔ میرے بچّے کو کچھ نہ ہو۔ اے بھگوان تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔

شیکھر : (حسنہ کے رکھے ہوئے پھولوں کے گجرے دیکھتے ہوئے) رامو۔ یہ پھول کیسے ہیں ؟

رامو : (چپ رہتا ہے)

شیکھر : (اچانک جیسے اُسے یاد آجاتا ہے) ہاں ہیج۔ رامو ان پھولوں کو اٹھا کر باہر لے جاؤ ۔۔۔

(رامو رام رام کرتا ہوا پھولوں کو اٹھائے باہر جارہا ہوتا ہے کہ پردہ گرتا ہے۔)

تیسرا ایکٹ

چھ مہینے اور گزر چکے ہیں۔ منظر اُسی بند کمرے کا ہے۔
شام کا وقت ہے۔ شام کی پرچھائیاں ڈھل چکی ہیں۔ باہر بہت سردی ہے۔
اس بند برآمدے میں کوئی انگیٹھی نہیں ہے۔ انگیٹھی اندر گول کمرے میں دہک رہی ہے۔
جب پردہ اٹھتا ہے تو چیتن ٹیلیفون سُن رہا ہوتا ہے۔ روما اس کے پاس کھڑی منہ اٹھائے پیار بھری نظروں سے اسے دیکھ رہی ہے ——

چیتن : (ٹیلیفون میں) جی ڈیڈی ...... امّی ابھی نہیں آئیں۔ ڈیڈی .... اچھا ڈیڈی، میں سمجھ گیا ڈیڈی۔ (سمجھاتے ہوئے) حسنہ آنٹی جب آئیں گی تو میں کہوں گا کہ ڈیڈی کو آدھے گھنٹے کی دیر ہو جائے گی۔ انتظار کیجیے .... اچھا ڈیڈی ...... جی ..... رامو سے کہہ کر چائے منگوا دوں گا۔ (رسیور کریڈل پر رکھ دیتا ہے۔)

روما : کیا تمہیں حُسنہ آنٹی اچھی لگتی ہے —؟

چیتن : (سر ہلاتے ہوئے) نہیں۔

روما : تمہیں پریم انکل اچھے لگتے ہیں ؟

چیتن : (پھر سر ہلاتے ہوئے) نہیں۔

روما : مجھے تو کملا آنٹی اچھی لگتی ہے۔

چیتن : کملا آنٹی اور کیلاش انکل ! ہر وقت ہنستے رہتے ہیں۔ ہیں نا ——

روما : آج کل کملا آنٹی اسکول نہیں جاتی ہے۔

چیتن : اِدھر ہمارے گھر بھی کبھی نہیں آئی۔

روما : (ہنستے ہوئے) کیا تم جانتے ہو —— کملا آنٹی کا پیٹ پھول کر موٹے لالہ جیسا ہو گیا ہے۔

چیتن : کملا آنٹی نے اس میں پیسے چھپا رکھے ہوں گے۔

روما : (ہنستے ہوئے) یہ بات نہیں۔

چیتن : تو پھر اُس میں اور کیا ہے ــــ؟
روما : اِدھر آؤ۔ تمہارے کان میں بتاؤں۔
(روما چیتن کے کان میں کھسر پھسر کرتی ہے ــــ دونوں ہنس پڑتے ہیں)
چیتن : رامو کی بیوی کا پیٹ بھی تو پھولتا جا رہا ہے۔
روما : ہاں ــــ
چیتن : امّی کہتی ہیں کہ اس نے ہمارے باغ کے پھل اپنے پیٹ میں چھپا رکھے ہیں۔
روما : نہیں۔ یہ بات نہیں۔ بات تو وہی ہے۔
(روما پھر اس کے کان میں کچھ کھسر پھسر کرتی ہے اور دونوں کھِلکھلا کر ہنس پڑتے ہیں)
چیتن : جبھی رامو آج کل اس کی بڑی خاطر کرتا ہے۔ جب دیکھو کوارٹر میں گھسا رہتا ہے۔
روما : باہر شاید کوئی ٹیکسی آئی ہے۔
چیتن : (اُٹھ کر دیکھتے ہوئے) حُسنہ آنٹی آگئیں۔
روما : چلو۔ ہم اوپر کے کمرے میں چلیں ــــ "گھر گھر" کھیلیں گے۔
حسنہ : کمرے میں آکر) ہیلو چیتن!
چیتن : ہیلو۔ آنٹی۔
حسنہ : تمہارے ڈیڈی اوپر یا گول کمرے میں؟
چیتن : آنٹی۔ ڈیڈی کا فون آیا تھا۔ وہ آدھے گھنٹہ تک آئیں گے۔ آپ ان کا انتظار کیجیے۔
حسنہ : اچھا بیٹا۔
چیتن : ٹاٹا آنٹی۔
حسنہ : تم کہاں جا رہے ہو بیٹا! یہیں برآمدے میں کھیلو۔
چیتن : آنٹی۔ ہم اوپر کے کمرے میں کھیلیں گے۔
(حسنہ چیتن کو جبراً پکڑتی ہے۔)
چیتن : نہیں آنٹی، نہیں،
حسنہ : دیکھو تو سہی ــــ میں تمہارے لیے کیا لائی ہوں ــــ
چیتن : (منہ بسورتے ہوئے) نہیں آنٹی۔ میں اوپر جاؤں گا۔

حسنہ : ایک منٹ تو ٹھہرو۔ دیکھو تو سہی کہ میں تمہارے لیے کیا لائی ہوں۔
چیتن : نہیں آنٹی ــــ میں روما کے ساتھ کھیلوں گا۔
حسنہ : تم روما سے یہیں کھیلو۔
چیتن : نہیں آنٹی۔

(حسنہ پرس میں سے ایک گھڑی نکال کر چیتن کو دکھاتی ہے۔
چیتن گھڑی کو دیکھ کر خوش ہو جاتا ہے۔)

حسنہ : تمہیں یہ گھڑی پسند ہے ؟
(چیتن جیسے ایک لمحہ کے لیے شش و پنج میں پڑ گیا ہو۔)
حسنہ : لاؤ۔ تمہاری کلائی پر باندھ دوں ــــ کتنی پیاری گھڑی ہے۔
(چیتن کبھی روما اور کبھی گھڑی کی طرف دیکھتا ہے)
حسنہ : سونے کی ہے۔ میں نے تمہارے لیے بمبئی سے منگوائی ہے۔
(چیتن کبھی گھڑی کی طرف دیکھتا ہے اور کبھی روما کی طرف)
حسنہ : دیکھو۔ گھڑی کے پیچھے تمہارا نام لکھا ہوا ہے۔

(اس بار جب چیتن روما کی طرف دیکھتا ہے تو روما مسکرا پڑتی ہے
اور جیسے بچے نے اچانک کوئی فیصلہ کر لیا ہو۔)

چیتن : نہیں آنٹی۔ میں تو اوپر روما سے جا کر کھیلوں گا۔ (کچھ سیڑھیاں چڑھ کر) آنٹی ! اندر گول کمرے میں انگیٹھی دہک رہی ہے۔ انتظار کیجیے۔ ڈیڈی آ رہے ہوں گے۔

(حسنہ مایوسی سے بچے کی طرف دیکھتی رہ جاتی ہے کہ چیتن اپنی
دوست کے ساتھ سیڑھیاں چڑھ جاتا ہے۔)

پریم : (کمرے میں آ کر) ہیلو۔
(حسنہ ویسی کی ویسی خیالوں میں کھوئی کھڑی رہتی ہے۔)
پریم : (ذرا بلند آواز سے) ہیلو مس کامران !
حسنہ : (چونک کر) اوہ ــــ ہیلو۔ معاف کیجیے گا۔ میں اِن بچّوں کو دیکھتے ہوئے نہ جانے کہاں کھو گئی تھی۔
پریم : آج کل زمانہ ہی کچھ ایسا آ گیا ہے۔ ہر کسی کو آپا دھاپی پڑی رہتی ہے ــــ پچھلے چوک میں

مَیں اپنی جلدی میں تھا۔ اُدھر ایک ٹیکسی والا بھی اپنی جلدی میں تھا۔ نتیجہ ——— ہماری موٹروں کی ٹکّر ہو گئی۔ پتہ نہیں۔ میں کیسے بچ گیا۔ مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا ———

حسنہ : اور آپ کی موٹر ؟

پریم : اسے اِنشورنس والوں کے حوالے کر آیا ہوں ———

حسنہ : آج کل کی زندگی میں کتنی سہولتیں ہیں ———

پریم : ہاں ——— مگر مجھے تو یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے موت سے آنکھ بچا کر اِدھر چلا آیا ہوں۔

حسنہ : (چھیڑتے ہوئے) ——— زندگی کی طرف ؟

(دونوں بیٹھ جاتے ہیں۔)

پریم : کیوں ——— گھر کے لوگ کہاں گئے ؟

حسنہ : مسز شیکھر تو شاید کہیں باہر ہیں۔

پریم : (گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے) ان کو اب تک آ جانا چاہیے تھا۔

حسنہ : اور شیکھر ابھی دفتر میں ہیں ——— ٹیلیفون آیا تھا کہ وہ آدھے گھنٹے تک آئیں گے۔

پریم : یہ شیکھر تو کام کا کیڑا ہے ——— بھلے مانس! تو دفتر سے اُٹھ تاکہ تیرا عملہ بھی گھر جائے ———

حسنہ : اور مسز شیکھر کسی دوکان میں گھس گئی ہوں گی۔ اس عورت کو پیسے خرچنے کا کتنا شوق ہے!

(باہر بادل گرجتے ہیں۔)

پریم : باہر کالی گھٹا گھر کر اُمڈی آ رہی ہے ———

حسنہ : آسمان جیسے پھٹ پڑنے کو ہو ———

پریم : سردیوں کی بارش مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔ سردیوں کے ٹھنڈے ٹھنڈے دن ——— باہر موسلا دھار بارش۔ کمرے میں آگ .....

(باہر مور بولتا ہے)

حسنہ : یہ کس کی آواز ہے ———؟

پریم : مور بول رہا ہے۔

حسنہ : مور پر اس وقت کیا مصیبت ٹوٹی ہے؟

پریم : مور ——— مورنی کو پکار رہا ہے۔

(ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے لگتی ہے جسے پریم سننے کے لیے جاتا ہے)

حسنہ : شیکھر کا فون ہوگا۔

پریم : ہیلو..... ہاں دمّی ــــ میں تو کب سے انتظار کر رہا ہوں.... میری موٹر کو حادثہ پیش آگیا۔ بس بچ ہی گیا۔ چار دن شاید تمہاری محبت کے اور دیکھنے تھے۔

(حسنہ پریم کو ٹیلیفون پر مصروف دیکھ کر چپکے سے گول کمرے میں چلی جاتی ہے)

جی.... جی.... جی.... جی نہیں.... آپ سیدھی آرہی ہیں.... اچھا تو دس منٹ تک اور انتظار کیے لیتا ہوں۔ جی۔ جی۔ جی۔ جی.... اچھا ــ (رسیور کریڈل پر رکھ دیتا ہے)

رامو : (کمرے میں آکر) صاحب ــ چائے لاؤں ــ؟ بی بی جی کہہ گئی تھیں کہ شاید ان کو دیر ہوجائے۔ موٹر کچھ خراب تھی۔ پیدل گئی ہیں کہ سیر ہوجائے گی موسم بھی بہت خراب ہے۔

پریم : رامو۔ چائے چھوڑو۔ یہ بتاؤ آج کل تمہاری بیوی کا کیا حال ہے ــ؟

رامو : صاحب بھگوان کا شکر ہے۔ اس کا خبط اس کے سر سے اُتر گیا ہے۔ اب تو صاحب ..... اب تو ....

(شرماتے ہوئے نظریں جھکا لیتا ہے۔)

پریم : کیوں ــ کیا کوئی بچّہ آرہا ہے ؟

رامو : بھگوان کی کرپا ہے ــ مجھ سے ایک غلطی ہونے لگی تھی۔ مجھے میری بیوی نے بچا لیا۔ ایک غلطی اس سے ہونے والی تھی، اس کو میں نے بچا لیا ــ انسان غلطیوں کا پتلا ہے بے عیب تو وہی اوپر والا ہے۔

(اچانک ادھر بچّوں کے کھلکھلا کر ہنسنے کی آواز آتی ہے)

پریم : اوپر چیتن کھیل رہا ہے ؟

رامو : ہاں صاحب۔ دن بھر پڑوسیوں کی بچّی اور ہمارا چیتن کھیلتے رہتے ہیں ان کی آپس میں بڑی بنتی ہے۔

پریم : اچھا رامو۔ چائے لے آؤ۔ مگر جلدی۔ بی بی جی آتی ہی ہوں گی اور ہمیں کہیں جانا ہے۔

رامو : اچھا صاحب۔

(رامو جاتا ہے۔)

پریم : ہیں۔ باہر تو بارش ہو رہی ہے۔ ایک دم موسلا دھار بارش!

(پریم دروازے کے پاس کھڑے ہو کر باہر بارش کو دیکھتا ہے۔ کمرے میں اندھیرا ہو جاتا ہے۔)

حسنہ : (کمرے میں آ کر) آپ اندر کیوں نہیں چلے آتے۔ کمرے میں بڑی پیاری انگیٹھی دہک رہی ہے۔

پریم : میں نے کہا نا — مجھے بارش بہت پیاری لگتی ہے۔

حسنہ : یہ بارش نہیں۔ اچھا خاصہ طوفان ہے۔ سڑکوں پر درخت جیسے ٹوٹ رہے ہوں۔

پریم : کتنی دیر سے باہر بادل برسنے کو تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ برس کر رہے گا اور یوں ہی برسے گا۔

حسنہ : مجھے تو سردی لگ رہی ہے۔ بوچھاڑ اندر تک آ رہی ہے۔ ہائے۔ میرا تو دوپٹہ سنبھالے نہیں سنبھلتا۔

(پریم حسنہ کی طرف دیکھتا ہے۔ اس کا دوپٹہ ڈھلک رہا ہے، اس کے بال اڑ رہے ہیں۔ ایک عجیب سا حسن اس کے چہرے سے جھلک رہا ہے)

پریم : میرا جی چاہتا ہے کہ میں باہر نکل جاؤں۔ جتنا بھیانک طوفان ہوتا ہے مجھے اس میں اتنا ہی رچ بس جانے کا لطف آتا ہے۔

(بادل زور سے گرجتے ہیں۔ بجلی چمکتی ہے۔ بادلوں کی خوفناک گرج سے حسنہ جیسے لرز جاتی ہے)

حسنہ : نا بابا۔ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے — بادل کیسے گرج رہے ہیں۔ بجلی کیسی چمک رہی ہے۔ رات کو اگر یوں بارش ہونے لگتی ہے تو میں کمرے میں اکیلی سو نہیں سکتی۔ میں کسی کو بلا لیتی ہوں۔ یا کسی کے پاس چلی جاتی ہوں۔

پریم : اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے۔ جب آندھی آتی ہے، طوفان دندناتا ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے مجھ سے کوئی چھیڑ چھاڑ کر رہا ہے۔

حسنہ : ایک بار ہم سری نگر گئے اور نسیم باغ کے خیموں میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ پہلی رات ہی ایسا طوفان آیا۔ بارش یوں ہی ہوئی۔ بادل ایسے ہی گرجے تھے۔ پھر کتنی تیز آندھی آئی کہ میرا خیمہ اکھڑ کر میرے اوپر آ گرا۔

پریم : اس دن جیسی بارش جب بھی ہوتی ہے تو آپ کو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے چھت گر پڑے گی۔

(ہنسنے لگتا ہے)

حسنہ : کہتے تو ہیں کہ سانپ کا کاٹا رسّی سے ڈرتا ہے۔

پریم : آخر ان گھر والوں کو کیا ہو گیا ہے — دونوں ہی غائب ہیں۔

حسنہ : بیچارے بارش میں کہیں اٹک گئے ہوں گے۔ بارش بھی یوں ہو رہی ہے جیسے آج برس کر پھر نہ برسے گی۔

پریم : دمّو تو پیدل آ رہی ہے — آج ہی اُسے سیر کا شوق چرایا تھا۔ ہر بات اگر وقت پر کسی کو کرنی ہو تو وہ شیکھر سے سیکھے۔

حسنہ : شیکھر کی طرف دیکھو — کسی کا دفتر چار بجے بند ہوتا ہے، کسی کا دفتر پانچ بجے بند ہوتا ہے — مگر صاحب بہادر کا دفتر ابھی تک لگا ہوا ہے۔

پریم : کتنی پیاری بارش ہو رہی ہے۔

حسنہ : ہائے۔ اندھیرا کتنا گہرا ہو گیا ہے۔ میں بتّی جلا دوں ؟

پریم : ہاں جلا ہی دینی چاہیے۔

حسنہ : (چھیڑتے ہوئے) اندھیرا اچھا ہوتا ہے۔ اندھیرے میں لاکھ عیب چھپے رہتے ہیں۔

پریم : اندھیرے کی چادر میں من کی سیاہی بھی چھپ جاتی ہے اور تن کی میل بھی۔

حسنہ : مجھے تو سردی لگ رہی ہے — میں تو اندر آگ کے پاس بیٹھتی ہوں۔

(حسنہ شرماتی اور مسکراتی ہوئی اندر چلی جاتی ہے۔)

پریم : (اپنے آپ سے) جھکڑ کس رفتار سے چل رہا ہے۔ بارش کتنی زور سے ہو رہی ہے۔

رامو : (بائیں دروازے سے چائے لاتے ہوئے) صاحب۔ چائے۔ بارش تو دیکھیے کیسی ہو رہی ہے۔ بی بی جی راستے ہی میں کہیں رک گئی ہوں گی۔

(رامو پریم کے لیے ایک صوفے کے سامنے میز رکھ کر چائے سجاتا ہے)

پریم : (صوفے کی طرف آتے ہوئے) رامو۔ کیا تم چائے کا صرف ایک پیالہ لائے ہو ؟ اندر مس کامران بھی بیٹھی ہیں۔ ان سے بھی پوچھ لو۔ وہ بھی شاید چائے پئیں گی۔

رامو : اچھا۔ وہ بھی آئی ہوئی ہیں۔

پریم : وہ تو مجھ سے بھی پہلے کی آئی ہوئی ہیں۔

رامو : مجھے خبر نہیں۔

(اندر جاتا ہے)

پریم : (چائے بناتے ہوئے) یہ بارش معلوم نہیں کہ فصلوں کے لیے اچھی ہے یا بری — ہم دھرتی کے بیٹے کسان سے اتنے دُور ہو گئے ہیں کہ ہمیں اس بات کا بھی پتہ نہیں ہوتا کہ کون سی بات اُس کے حق میں ہوتی ہے اور کون سی نہیں۔

رامو : (کمرے میں آکر) وہ کہہ رہی ہیں کہ چائے کا پیالہ میں ان کو وہیں دے آؤں۔

پریم : اچھا تو تم ایک خالی پیالہ لے آؤ۔

رامو : بہت اچھا صاحب!

(رامو باہر جاتا ہے۔ بارش اسی طرح ہو رہی ہے — پریم چائے کا پیالہ بنا کر اندر حسنہ کو دینے کے لیے جاتا ہے۔ اس کے ایک ہاتھ میں چائے کا پیالہ ہے اور دوسرے ہاتھ میں مٹھائی کی پلیٹ ہے۔ گول کمرے میں گئے ہوئے ابھی اسے چند سکنڈ ہی ہوئے ہیں کہ اندر سے حسنہ کی چیخ سنائی دیتی ہے۔ ساتھ ساتھ پیالہ کے نیچے گر کر ٹوٹنے کی آواز آتی ہے اور پھر حسنہ اور پریم دونوں ہنستے ہوئے باہر آجاتے ہیں۔)

حسنہ : (ہنستے ہوئے) آپ نے پیالہ ہی کچھ اس طرح تھمایا۔

پریم : (ہنستے ہوئے) پیالہ تھمانے کا کیا قصور تھا۔ آپ کا دھیان ہی کسی اور طرف تھا۔

حسنہ : دراصل میں یہ سمجھی کہ رامو چائے لے کر آیا ہے۔ اور ادھر میں نے کتاب پر سے نظریں اٹھا کر آپ کو دیکھا۔ اوپر سے آپ نے پیالہ میرے ہاتھ میں تھمایا۔ میں ایک دم ہڑبڑا گئی۔

(دونوں ہنستے جا رہے ہیں، ہنستے جا رہے ہیں۔)

پریم : شکر ہے کہ گرم گرم چائے آپ کے پاؤں پر نہ پڑی۔

حسنہ : ہاں۔ پیر تو بچ گیا — لیکن میری شلوار کا پائینچہ ستیاناس ہو گیا۔

پریم : آج کل کی لڑکی پیر جلا لے گی مگر اپنی شلوار کی کریز خراب نہیں ہونے دے گی۔

رامو : (کمرے میں آکر) صاحب میں چائے بنا دوں؟

حسنہ : نہیں رامو۔ چائے میں بناؤں گی۔ تم ایک پیالہ اور لے آؤ۔ پہلا پیالہ ٹوٹ گیا ہے۔ اندر سے

پیالے کے ٹکڑے بھی سمیٹ لینا۔

پریم : بیچاروں کے قالین کا ستیاناس ہو گیا۔

حسنہ : (چائے بناتے ہوئے) جب گھر والے گھر میں نہیں ہوتے، جب کھیت کے مالک کھیت میں نہیں ہوتے تو کئی بار باڑھ ہی کھیت کو کھانے لگتی ہے۔

پریم : ہاں — یہ سزا اُن کو اچھی ملی۔

حسنہ : چینی کتنی ؟

پریم : ایک چمچہ ڈال دو۔ یوں تو آپ کے لمس ہی سے پیالہ کافی میٹھا ہو چکا ہے۔

حسنہ : پھر چینی ڈالنے کی کیا ضرورت ہے۔

(پریم کو چینی ڈالے بغیر چائے کا پیالہ تھماتی ہے۔)

پریم : ہیں۔ یہ پیالہ آپ پیجیے۔ میں اتنے میں سگریٹ سلگاتا ہوں۔

حسنہ : باہر بارش کس تیزی سے ہو رہی ہے۔

پریم : (سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے) آپ کو بارش پسند نہیں۔

حسنہ : (پریم کی نیم وا آنکھوں کی طرف دیکھتے ہوئے) پسند — ناپسند کی کوئی بات نہیں۔ اصل میں مجھے سردی بہت لگ رہی ہے۔

پریم : چائے سردی کا علاج ہے۔ سردی کا علاج ......

رامو : (پیالہ رکھتے ہوئے) کچھ اور لاؤں ؟

حسنہ : شکریہ رامو۔ (پریم کے لیے چائے بناتی ہے) رامو۔ تم اب آرام کرو۔

پریم : (سگریٹ یوں پی رہا ہے جیسے اس پر سرمستی طاری ہوئی جا رہی ہو) کیا آپ نے کبھی سگریٹ نہیں پیا حسنہ ؟ معاف کیجیے گا مس کامران ——

حسنہ : نہیں مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میں تو خود یہ چاہ رہی تھی کہ آپ...... (سگریٹ سلگا لیتی ہے) ہوسٹل کے کمرے میں اکیلی بیٹھتی ہوں تو صرف سگریٹ ہی میرا ساتھ دیتے ہیں۔

پریم : میں تو سگریٹ صرف......

(پریم ایک دم خاموش ہو جاتا ہے۔ کچھ دیر تک سوچ میں ڈوبا ہوا اپنا سگریٹ پلیٹ میں مسل دیتا ہے۔)

حسنہ : (سگریٹ کا ایک کش لگاتے ہوئے) آپ اچانک خاموش کیوں ہو گئے ؟
پریم : (اب بھی خاموش رہتا ہے)
حسنہ : آپ یوں خاموش کیوں ہو گئے ؟
(پریم ایک کشمکش میں ہے اور اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں)
حسنہ : آپ کو یہ کیا ہو گیا ؟
(حسنہ اٹھ کر پریم کے پاس جا بیٹھتی ہے۔)
پریم : نہیں۔حسنہ۔ نہ جانے مجھے کیا ہو رہا ہے۔
حسنہ : لیجیے۔سگریٹ پیجیے۔
(سگریٹ نکال کر اسے پیش کرتی ہے۔ اس کے لیے دیا سلائی جلاتی ہے)
پریم : (کش لگاتے ہوئے) شکریہ حسنہ۔ بہت بہت شکریہ !
حسنہ : (پیار سے) پریم !
(کچھ دیر کے لیے دونوں خاموش رہتے ہیں جیسے خیالات میں کھو گئے ہوں۔)
پریم : باہر پانی پڑ رہا ہے۔ پڑے جا رہا ہے۔
حسنہ : ہاں پریم۔ پانی برسے جا رہا ہے۔
پریم : آج کل کی بارش مجھ پہ جادو سا کر دیتی ہے۔
حسنہ : میں اندر آگ کی خاموشی کے پاس جا بیٹھی۔ مجھے آپ کی آنکھوں میں طوفان امڈتا ہوا نظر آیا تھا۔
پریم : جھکڑ کی اس رفتار کی لپیٹ سے کوئی بھلا بچ سکتا ہے ؟
حسنہ : لاکھوں طوفان دلوں میں خاموش پڑے رہتے ہیں۔ ایک ہی لمس جھنجھوڑ کر ان کو بیدار کر دیتا ہے۔
(ایک سگریٹ بجھا کر دوسرا جلا لیتی ہے)
پریم : پھر تو تمہیں ڈر نہیں لگنا چاہیے۔ جن کے دل میں طوفان ہوتے ہیں وہ باہر کی آندھیوں سے کبھی نہیں ڈرتے۔
حسنہ : سچ !

پریم : ہاں حسنہ ۔ مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میرے پَر مجھے اڑا کر کہیں نہ کہیں لے جائیں گے۔
(حُسنہ پریم کی طرف دیکھتی ہے۔ پریم سگریٹ کے دھوئیں سے دائرے بنا رہا ہے ۔)

حسنہ : آپ دھوئیں کے یہ گول چکّر کیسے بنا لیتے ہیں ؟

پریم : جن ہونٹوں نے محبت کی ہو ان ہونٹوں کو ایسے چکر بنانے آجاتے ہیں ۔

حسنہ : محبّت تو میں نے بھی.......

پریم : حسنہ تو نے محبت نہیں کی ہے ۔ تو ابھی چھوٹی تھی کہ تیرے سر پر سے تیرے والد کا سایہ اُٹھ گیا ـــــ اور تو جب جوان ہوئی تو تجھے یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ کوئی تجھ سے محبّت کرے ـــــ تجھے ضرورت محسوس ہوئی کہ کوئی تیرے ہر تبسّم کی داد دے لیکن اس سے بھی زیادہ بڑی ضرورت تھی جو تیرے دل کے گوشے میں خوابیدہ تھی، وہ ضرورت تھی ایک مرد کی ـــــ جو تیری زندگی میں تیرے پتا کی عدم موجودگی کے خلا کو پُر کرسکے ۔ جس کی طرف تو یوں دیکھ سکے کہ جیسے ایک بیٹی اپنے باپ کی طرف دیکھتی ہے، لاکھ سوال اپنی پلکوں میں چھپائے ہوئے.... ۔۔ اور تیری ملاقات شیکھر سے ہوئی ـــــ

حسنہ : پریم !

پریم : ہاں حسنہ ، میں غلط نہیں کہہ رہا ہوں ۔ شیکھر نے تیری دونوں ضرورتیں پوری کر دیں ۔

حسنہ : (گھبرا کر) پریم !

پریم : شیکھر نے تجھ سے محبت کی جیسے ایک نوجوان مرد نوجوان عورت سے کرتا ہے ـــــ شیکھر نے تجھے وہ محبت دی جو ایک باپ اپنی بیٹی کو دیتا ہے ۔

حسنہ : (چیختے ہوئے) پریم ۔

پریم : اگر تجھے تمام عمر میکے میں رہنا منظور ہے تو پھر بات اور ہے ۔

حسنہ : نہیں پریم ۔ نہیں پریم ۔

(باہر سڑک پر دو موٹروں کے ایک دم بریک لگنے کی آواز آتی ہے ۔)

پریم : باہر سڑک پر یوں لگتا ہے جیسے ٹکّر ہو گئی ہو ۔ میں دیکھ کر آتا ہوں ۔

حسنہ : پریم ۔

(باہر بجلی چمکتی ہے۔ بادل بھیانک انداز میں گرجتے ہیں)

پریم : میں ابھی آتا ہوں۔

حسنہ : (پکارتے ہوئے) پریم۔ پریم! باہر بجلی کیسی چمک رہی ہے۔ باہر بادل کیسے گرج رہے ہیں۔ تم مجھے اکیلا چھوڑ کر نہ جاؤ۔

(پریم دوڑتا ہوا باہر چلا جاتا ہے۔)

حسنہ : چلا گیا۔ یہ تو یوں ہی چلا جائے گا۔ کب آیا اور کب گیا۔ (آنکھوں میں آنسو لاتے ہوئے) زندگی کے چور دروازے سے داخل ہوا تھا اور زندگی کے چور دروازے سے نکل گیا ہے۔ شیکھر ہوتا تو مجھے یوں چھوڑ کر نہ جاتا۔ نہیں نہیں۔ نہیں۔ میں شیکھر کو تو کبھی نہیں چھوڑ سکتی۔ شیکھر کے بغیر مجھے گردو پیش سونا سونا سا محسوس ہوگا ـــــ میری زندگی میں شیکھر کی ایک جگہ بن چکی ہے۔ شیکھر نہ ہوگا تو مجھے یوں محسوس ہوگا جیسے باڑ کے بغیر کوئی باغیچہ ہو۔ میں شیکھر کو ہرگز نہیں چھوڑ سکتی۔ جب سے ہماری ملاقات ہوئی ہے شیکھر برابر جوان ہوتا جارہا ہے۔ برابر حسین ہوا جارہا ہے۔ میں شیکھر کو ہرگز نہیں چھوڑ سکتی۔ میں شیکھر کو ہرگز نہیں چھوڑ سکتی۔

(اتنے میں بجلی پھر چمکتی ہے۔ بادل گرجتے ہیں اور حسنہ گھبرا کر چیختے ہوئے دوڑتی ہوئی گول کمرے میں چلی جاتی ہے۔ دروازہ اندر سے بند کر لیتی ہے۔)

پریم : (بارش میں شرابور آتا ہے) حسنہ! حسنہ تو کدھر چلی گئی۔ (سامنے گول کمرے کے بند دروازے کی طرف جاتے ہوئے) حسنہ! حسنہ تو نے دروازہ اس طرح کیوں بند کر لیا ہے۔ (دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے) حسنہ۔ حسنہ۔ حسنہ! اپنے آپ پر یوں خول چڑھا لیا! مجھے معلوم نہیں تھا حسنہ کہ تو اتنی بزدل ہے۔ کمزور کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لینے سے کوئی خطرہ سے نہیں بچ سکتا۔ زندگی کے تلخ اور کڑے حقائق کا سامنا نہ کرنا، انتہائی بزدلی ہے! محبّت کی شاہراہ پر خطرے بھی ہوتے ہیں۔ محبت کی شاہراہ پر بہاریں بھی ہیں۔ ایک ماتم بندگلی کا ماتم ہوتا ہے ـــــ ایک ماتم تاریک بِل کا ماتم ہوتا ہے۔ ایک ماتم اپنی خود اعتمادی کا ماتم ہوتا ہے۔ ایک ماتم اپنی خود پسندی کا ماتم ہوتا ہے ـــــ (دروازے زور زور سے کھٹکھٹاتا ہے) حسنہ! میں یہ دروازہ توڑ دوں گا۔

تو ایک بار باہر آجا۔ تو باہر آکر چاہے مجھے ٹھکرا دے ـــــ

(اتنے میں بجلی پھر چمکتی ہے۔ بادل گرجتے ہیں۔ حسنہ گھبرا کر دروازہ کھول دیتی ہے)

حسنہ : (پریم کو دیکھ کر جیسے پھر پگھل جاتی ہے) پریم!

پریم : (اُسے پکڑ کر باہر لے جاتا ہے) حسنہ تو اتنی بے حس کیوں ہو گئی ہے۔

حسنہ : پریم ـــــ

پریم : (اسے کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑتا ہے) حُسنہ! تو اس دن کا تصور کر جب تجھے اپنے گردوپیش سے بُو آئے گی۔ جب شیکھر کی دولت، شیکھر کا مرتبہ اور شیکھر کی موٹریں، کوٹھیاں تیری پیاس نہیں بجھا سکیں گی! جب تو پیچھے مڑ کر اس حسین شام کو یاد کرے گی جیسے کوئی قیدی ہرنی گردن اٹھا اٹھا کر جنگل کی ہریالی سے اپنی آنکھوں کی بھوک مٹاتی ہے ـــــ

(وقفہ)

حسنہ : پریم۔ پہلی بار جب شیکھر مجھے باہر لے کر گیا تو اس کی کنپٹیوں پر سفید بال دیکھ کر میں نے بھی سوچا تھا کہ مجھے اُس میں سے بو آئے گی لیکن مجھے اُس میں سے خوش بُو آتی تھی۔

پریم : حسنہ! تیرا حسن اتنا بے مثال ہے اور اس امڈی ہوئی جوانی میں تو اپنے آپ کو دوسرے میں ڈھونڈنے لگی ہے۔ شیکھر اب بھی دمّی کو پیار کرتا ہے ـــــ دمّی ـــــ لاکھ پریم شیکھر کے بیٹے پر سے وار کر سکتی ہے۔ اور شیکھر تجھ جیسی لاکھ خوبصورت عورتیں اپنی بیوی کے لختِ جگر پر وار دے گا۔ حسنہ۔ تو اس وقت جوان ہے۔ تیری پلکوں میں جادو خوابیدہ ہیں جو سو سو سپنے جگا سکتے ہیں۔ تیرے انگ انگ سے مہک اُٹھ رہی ہے جو تیرے گردوپیش بھی خوشبوئیں بکھیرتی رہتی ہے۔ تیری ایک نظر، تیرے ایک لمس اور تیرے ایک تبسّم کے لیے مرد سو سو بار جی سکتا ہے۔ سو سو بار مر سکتا ہے۔ حسنہ! تو اب اس مقام پر پہنچ چکی ہے جہاں پہنچ کر عورت اپنے والد کے گھر کی طرف اپنی پیٹھ کر لیتی ہے اور جہاں اس کی نظر افق پر جمی رہتی ہے ـــــ حسنہ! زندگی کو آغوش میں لے کر اس لمحہ کو جاوداں بنا دے ـــــ دن بار بار نہیں آتے۔

رامو : (کمرے میں آکر) صاحب کچھ اور چاہیے ہو تو.....

حسنہ : نہیں۔

(راموگول کمرے کی طرف جانے کے لیے آگے بڑھتا ہے۔)

پریم : رامو۔ تم کیا کرنے لگے ہو ؟

رامو : میں ٹوٹا ہوا پیالہ اٹھا لوں صاحب۔

حسنہ : رامو!

پریم : راموتم پہلے ٹیکسی لے آؤ۔

(رامو باہر جاتا ہے)

حسنہ : آپ نے جیسے میرے منہ کی بات چھین لی۔

(دونوں ایک دوسرے کی طرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھے جارہے ہیں۔ ایک دوسرے کی جوانی کو۔ ایک دوسرے کے حسن کو۔ ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے اور بجتی چلی جاتی ہے۔ کوئی اُسے نہیں سنتا۔ گھنٹی بج بج کر بند ہو جاتی ہے۔)

پریم : (ایک دم جیسے سپنے سے بیدار ہوتے ہوئے) کیا ٹیلیفون کی گھنٹی بج رہی تھی۔

حسنہ : شاید بج رہی تھی۔

پریم : مجھے یوں لگتا ہے، یوں لگتا ہے......

حسنہ : تجھے کیسا لگتا ہے پریم ——

پریم : تجھے کیا لگتا ہے حسنہ!

(دونوں مسکرانے لگتے ہیں)

حسنہ : مجھے تو یوں لگتا ہے، یوں لگتا ہے جیسے کوئی عمر بھر کے اُترے ہوئے پرانے کپڑے پہنتا رہا ہے۔ اور پھر جیسے کسی کو کسی کی پسند کی چیز بنا کر دے دی جائے۔

(دونوں ہنسنے لگتے ہیں)

پریم : عرصہ ہوا۔ ایک دن مینہ بھی پڑ رہا تھا، آندھی بھی چل رہی تھی، جھکّڑ بھی تھا میرا پاؤں پھسلا اور میں کیچڑ میں جا پڑا۔

حسنہ : آج باہر پھر بارش ہے۔ جھکّڑ ہے، آندھی ہے، طوفان ہے۔

پریم : اور مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے میرا پاؤں پھر پھسل گیا ہے اور میں کنارے پر آ گرا ہوں۔
حسنہ : (اٹھ کر دروازے کے پاس جاتی ہے) باہر بارش مسلسل پڑ رہی ہے۔
پریم : (حسنہ کے پاس جاتے ہوئے) مجھے مسلسل اور تیز بارش بہت اچھی لگتی ہے۔
حسنہ : ابھی تو بارش کو چاہیے کہ بند ہو جائے۔
پریم : مسافر کو نئی منزل نظر آ گئی ہے۔
حسنہ : نئی راہ پر چلنے کا کتنا چاؤ ہوتا ہے۔
پریم : گھونسلوں میں رہنے والے پنچھیوں کو بھی گھونسلوں میں آنا ہے۔

(دونوں مسکراتے ہیں)

حسنہ : شاید رامو ٹیکسی لے آیا۔
پریم : اتنی جلدی۔
حسنہ : نزدیک ہی مل گئی ہوگی۔
پریم : میں ایک سگریٹ اور سلگا لوں۔

(پریم ڈبّہ میں سے سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبا لیتا ہے اور حسنہ اس کا سگریٹ سلگاتی ہے۔)

حسنہ : تیرا سگریٹ جلاتے ہوئے پریم ......
پریم : تو رک کیوں گئی حسنہ!

(حسنہ پیار بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھے جا رہی ہے)

حسنہ : تیرا سگریٹ سلگاتے ہوئے پریم نہ مجھے اپنی ایڑیاں اٹھانی پڑتی ہیں نہ تجھے گھٹنوں کے بل جھکنا پڑتا ہے۔

(دونوں ہنسنے لگتے ہیں)

پریم : دمّی۔ بیچاری آج ہی پیدل چلی اور آج ہی پیچھے رہ گئی۔

(ہنستے ہنستے دونوں باہر چلے جاتے ہیں۔ ٹیکسی کے روانہ ہونے کی آواز آتی ہے۔)

رامو : (کمرے میں آ کر) چلے گئے۔ چلے گئے۔ ایسی بارش میں جو لوگ جاتے ہیں وہ کبھی واپس نہیں آتے۔

(ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے)

رامو : (فون سنتے ہوئے) ہاں جی صاحب.... جی صاحب... غلط نمبر ہے صاحب۔
(ٹیلیفون رکھ دیتا ہے ٹیلیفون کی گھنٹی پھر بجنے لگتی ہے۔)

رامو : ہیلو.... جی صاحب۔ میں چھ نمبر کوٹھی سے بول رہا ہوں.... جی سردار روڈ—چھ نمبر.... جی صدر روڈ نہیں سردار روڈ.... آپ کا غلط نمبر ہے.... میں چوکیدار ہوں، نمبر غلط ہے—آپ ٹیلیفون بند کر دیجیے۔ میں نوکر ہوں۔ مجھے ابھی اور بہت سے کام کرنے ہیں۔

(غصّے میں رسیور کریڈل پر رکھ دیتا ہے۔ رامو کے فون رکھنے کے آدھ منٹ بعد ٹیلیفون کی گھنٹی پھر بجنے لگتی ہے جس کی رامو کوئی پروا نہیں کرتا ٹیلیفون کی گھنٹی بج کر بند ہو جاتی ہے۔)

دمینتی : (کمرے میں آکر) رامو۔ پریم صاحب سے کہو کہ میں کپڑے تبدیل کر کے ابھی آتی ہوں۔

رامو : وہ تو گئے!

دمینتی : (حیران ہوکر) پریم چلا گیا! آخر اتنی بھی کیا جلدی تھی۔

رامو : پریم صاحب بھی گئے اور حسنہ بی بی بھی گئیں۔

دمینتی : اچھا حسنہ آئی ہوئی تھی!

رامو : حسنہ بی بی تو پریم صاحب سے پہلے آئی تھیں۔ آئیں اور گول کمرے میں بیٹھی رہیں۔

دمینتی : (مسکراتے ہوئے) حسنہ بی بی گول کمرے میں بیٹھی ہوئی انتظار کرتی رہیں اور پریم صاحب باہر برآمدے میں بیٹھے رہے!

رامو : نہیں میم صاحب۔ پہلے الگ الگ بیٹھے رہے۔ پھر باہر یہاں صوفے پر آکر بیٹھ گئے۔ کتنی دیر تک چائے پیتے رہے—چائے پیتے رہے، باتیں کرتے رہے۔ پھر اس دروازے کے پاس جا کھڑے ہو گئے۔ باہر برسات ہوتی دیکھتے رہے.... پھر....

دمینتی : یہ سگریٹ کون پیتا رہا؟

رامو : پریم صاحب بھی پیتے رہے تھے اور حسنہ بی بی بھی پیتی رہی تھیں۔

(دمینتی کا رنگ جو کچھ دیر سے بدل رہا تھا بالکل پیلا پڑ جاتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا اون کا پیکٹ پھسل کر نیچے گر جاتا ہے۔)

دمینتی : رامو۔ پریم صاحب نے سگریٹ نہیں پیے ہوں گے۔
(یوں کہہ رہی ہے جیسے واسطہ دے رہی ہو کہ رامو غلط ہی کہہ دے کہ پریم نے سگریٹ نہیں پیے ——اور وہ اپنے آپ کو دھوکہ دے لے —)

رامو : میں نے تو اپنی آنکھوں سے دیکھا بی بی جی۔ وہ تو سگریٹ پر سگریٹ پیتے رہے جسنہ بی بی سگریٹ سلگاتی تھیں اور پریم صاحب پیتے تھے۔

دمینتی : اور پھر پریم صاحب چلے گئے؟

رامو : دونوں اکٹھے گئے۔

دمینتی : کیا مطلب؟

رامو : انھوں نے ٹیکسی منگوائی اور دونوں اس میں بیٹھ کر چلے گئے۔ میں نے تو کہا بھی کہ بارش تھم جانے دیجیے ——پریم صاحب کہنے لگے۔ مجھے تو بارش بہت اچھی لگتی ہے ——
(وقفہ)

دمینتی : اچھا۔ رامو تم باہر بیٹھو۔ صاحب ابھی آتے ہی ہوں گے۔

رامو : اچھا بی بی جی۔ (باہر چلا جاتا ہے۔)

دمینتی : دونوں چلے گئے! (ہنسنے کی کوشش کرتی ہے مگر اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں۔)
دونوں چلے گئے! پہلے الگ الگ بیٹھے رہے —— ایک اندر گول کمرے میں —— ایک برآمدے میں —— پھر دونوں پاس پاس بیٹھے رہے۔ اکٹھے چائے پیتے رہے۔ اکٹھے باتیں کرتے رہے۔ اکٹھے سگریٹ پیتے رہے (پریم کی باتیں یاد کرتے ہوئے) "میں تو جو سگریٹ پیتا ہوں بس تمہارے ہی سامنے پیتا ہوں۔ دس منٹ تمہارے پاس بیٹھ کر جیسے مجھے طلب لگنے لگتی ہے" ——سگریٹ پیتے پیتے دروازے کے پاس جا کھڑے ہوئے۔ وہاں کھڑے کھڑے برسات ہوتی دیکھتے رہے۔ جھکڑ دیکھتے رہے، طوفان دیکھتے رہے اور پھر شام تاریکی میں تبدیل ہو گئی۔
(دمینتی پھر ہنسنے کی کوشش کرتی ہے مگر اس کی آنکھوں میں پھر آنسو اُمڈ آتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لیے خاموش رہتی ہے۔ پھر اضطراب میں

کبھی وہ ایک صوفے پر اور کبھی دوسرے صوفے پر بیٹھتی ہے۔ پاگلوں کی طرح کبھی اس پیالہ کو اٹھا کر دیکھتی ہے جس میں سے حسنہ نے چائے پی تھی۔ اس پیالے پر لپ اسٹک کے نشان ہیں۔ کبھی ایش ٹرے کو اٹھا کر دیکھتی ہے جس میں پریم کے پئے ہوئے سگریٹوں کے ٹکڑے ہیں۔ یوں پریشان اور مضطرب ہو رہی ہے کہ اوپر کمرے میں سے بچّوں کے ہنسنے کی آواز آتی ہے۔ دمینتی جیسے چونک اٹھتی ہے۔ بچّوں کے ہنسنے کی آواز پھر آتی ہے۔ اس بار دمینتی کے چہرے پر اُمید کی روشنی پھیل جاتی ہے ــــ اوپر کمرے میں بچّے ہنس رہے ہیں۔ ہنسے جا رہے ہیں۔ ان کی قلقاریاں سن کر دمینتی اٹھ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ بچّے اب بھی ہنس رہے ہیں اور ان کی معصوم اور بے ریا ہنسی جیسے دمینتی کو گرفت میں لیے ہوئے ہے ــــ وہ آہستہ آہستہ ــــ ایک ایک قدم رکھتی سیڑھیاں چڑھ کر بالائی منزل پر چلی جاتی ہے۔)

شیکھر : (رامو کے ساتھ آتے ہوئے) رامو۔ تم نے حسنہ بی بی کو چائے پلائی ؟

رامو : جی صاحب۔

شیکھر : گول کمرے میں انگیٹھی تو دہک رہی ہے ؟

رامو : جی صاحب۔

شیکھر : کوئی ٹیلیفون آیا تھا ؟

رامو : آیا تھا مگر نمبر غلط تھا۔

شیکھر : (گول کمرے کی طرف جاتے ہوئے) حسنہ !

رامو : صاحب۔ وہ تو چلی گئیں۔

شیکھر : چلی گئیں ــ کب ؟

رامو : ابھی ابھی گئی ہیں صاحب۔ وہ اور پریم بابو ساتھ گئے ہیں ٹیکسی میں۔

شیکھر : پریم آیا تھا ؟

رامو : جی۔

شیکھر : کب ؟
رامو : بارش سے تھوڑی دیر پہلے۔
شیکھر : اور پھر ؟
رامو : پہلے حسنہ بی بی گول کمرے میں بیٹھی رہیں، پریم بابو باہر۔ پھر دونوں باہر آ بیٹھے۔ باہر بیٹھے کتنی دیر چائے پیتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ پھر وہاں دروازے کے پاس جا کھڑے ہوئے۔ وہاں باہر بارش ہوتی دیکھتے رہے ___ پھر انھوں نے ٹیکسی منگوائی اور وہ چلے گئے۔
شیکھر : (غصّہ میں) چلے گئے۔ دونوں چلے گئے ؟

(غصّہ میں شیکھر سامنے گول کمرے میں چلا جاتا ہے رامو ایک پل کے لیے گھبراہٹ میں خاموش کھڑا رہتا ہے ___ پھر چائے کے برتن اٹھانے کے لیے آگے بڑھتا ہے)

شیکھر : (غصے میں) رامو
رامو : جی صاحب
شیکھر : اندر یہ برتن کس نے توڑے ہیں ؟
رامو : صاحب۔ حسنہ بی بی نے توڑے ہیں یا پریم صاحب نے۔
شیکھر : رامو ___ کیا تمھیں یہ بھی معلوم نہیں کہ برتن کس نے توڑے ہیں۔ قالین کا ستیاناس ہو گیا ہے۔
رامو : صاحب۔ حسنہ بی بی اندر بیٹھی تھیں۔ پریم بابو شاید انھیں اندر چائے دینے گئے اور پھر اندر برتن ٹوٹ گئے۔
شیکھر : (غصے میں) تم کہاں تھے ؟ تم کہاں رہتے ہو ؟ لوگ گھر کو لوٹ کر لے جائیں اور تمھیں کوئی خبر نہیں رہتی۔
رامو : صاحب۔
شیکھر : میرے سامنے سے ہٹ جاؤ رامو ___ نوکر ہوتے ہیں کہ گھر کا خیال رکھیں۔ وہ مالک کے لیے جان قربان کر دیتے ہیں۔
رامو : لیکن صاحب.....

شیکھر : راموتم یہاں سے چلے جاؤ۔ میں تمہاری صورت نہیں دیکھنا چاہتا۔

(راموباہر چلا جاتا ہے۔ شیکھر غصہ میں آگ بگولا برآمدے میں ٹہلنے لگتا ہے۔ اس کے ہونٹ پھڑپھڑاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں جیسے وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہو۔ یوں پریشان ہوکر وہ ٹہل رہا ہوتا ہے کہ اوپر کی منزل سے بچوں کے ہنسنے کی آواز آتی ہے۔ ہوبہو دمینتی کی طرح وہ بچوں کے ہنسنے کی آواز پر چونک پڑتا ہے۔ بچوں کے ہنسنے کی آواز پھر آتی ہے۔ اس بار ٹھیک دمینتی کی طرح شیکھر کے چہرے پر امید کی روشنی پھیل جاتی ہے۔ اوپر کمرے میں بچے ہنسے جا رہے ہیں، ہنستے جا رہے ہیں۔ ان کی قلقاریاں سُن کر وہ رک جاتا ہے۔ بچے اب بھی ہنس رہے ہیں اور ان کی معصوم اور بے ریا ہنسی شیکھر پر جادو سا کر دیتی ہے۔ آہستہ آہستہ ایک ایک قدم رکھتا ہوا مسحور سا سیڑھیاں چڑھتا ہوا بالائی منزل پر چلا جاتا ہے۔ اوپر کا دروازہ کھلتے ہی بلند ہنسی سنائی دیتی ہے۔ اس میں شیکھر اور دمینتی کی ہنسی بھی شامل ہے۔ ہنسی کی آواز آتی رہتی ہے۔ آتی رہتی ہے۔ اور پھر دھیمی پڑ جاتی ہے۔)

آیا : (راموکے ساتھ آتے ہوئے) رات بہت جا چکی ہے۔ تمہارے چیتن نے ہماری روما پر نہ جانے کیا جادو پھونک دیا ہے ــــ وہ تو یہاں سے ٹلنے کا نام نہیں لیتی۔

رامو : کون کسی کے کہے رہتا ہے اور کون کسی کے کہے جاتا ہے۔

آیا : اچھا تو تم اوپر جا کر اسے بلا لاؤ۔

رامو : نابابا۔ میں تو نہیں جاؤں گا۔ صاحب آج غصّے میں بھرے ہوئے ہیں۔

آیا : وہ کیوں ؟

رامو : حسنہ بی بی اور پریم بابو ایک ہی ٹیکسی میں بیٹھ کر چلے گئے ہیں۔

آیا : پریم بابو اور حسنہ بی بی کی جوڑی بری نہیں۔

رامو : ہاں۔ ہمارے صاحب اور میم صاحب کا جوڑا کیا بُرا ہے۔

(اوپر دروازہ کھلتا ہے۔ بچّوں کے ہنسنے کی آواز آتی ہے۔)

آپا : شاید نیچے ہی آرہے ہیں۔
رامو : تم ابھی باہر کھڑی رہو۔ میں اندر سے برتن لے آؤں۔
(رامو گول کمرے میں جاتا ہے)
آپا : (منہ چڑاتے ہوئے) "باہر کھڑی رہو"— آج کل کتنا مسکین بنتا ہے۔ بھیگی بلّی کی طرح۔ آنکھ سے آنکھ نہیں ملاتا۔

(باہر چلی جاتی ہے۔ سیڑھیوں پر سے روما اور جتین اترتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ روما شلوار قمیص پہنے ہوئے ہیر بنی ہوئی ہے۔ جتین نے رانجھے کا بھیس بدلا ہوا ہے۔ بچّوں کے پیچھے شیکھر اور منیتی آتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اتنے میں اندر گول کمرے میں سے چینی کے ٹوٹے ہوئے برتن اٹھائے رامو آتا ہے)

شیکھر : (پیار سے) رامو!
رامو : میں نے سوچا صاحب کہ یہ ٹوٹے ہوئے برتن باہر پھینک آؤں۔
جتین : دو دو ٹکڑے ہیں یہ تو جڑ جائیں گے۔ میں انھیں جوڑ سکتا ہوں۔
رامو : بیٹا ٹوٹ جو گئے۔ ان کو باہر پھینک آنے دو۔ گھر میں گندگی کیوں رہے۔
(آگے آگے بچّے اور پیچھے پیچھے منیتی اور شیکھر گول کمرے میں چلے جاتے ہیں۔ رامو ٹوٹے ہوئے برتن باہر لے جا رہا ہوتا ہے کہ پردہ گرتا ہے۔)

دمینتی

سنت سنگھ سیکھوں

دیباچہ

یہ ناٹک "دمینتی" مہابھارت کی مشہور کہانی "نل دمینتی" پر مبنی ہے۔ مجھے اس کہانی میں بہت سی قدیم کہانیوں کی طرح اشاریت دکھائی دیتی ہے جس کی عکاسی کی کوشش میں نے اس ناٹک میں کی ہے۔

میری رائے میں اس کہانی کا مرکزی خیال قدرت کی طاقتوں سے اس دھرتی پر اقتدار حاصل کرنے کے لیے انسان کی جانب سے کی گئی ریاضت ہے۔ نل انسان ہے اور دمینتی دھرتی ـــــ دیوتا قدرت کی مختلف طاقتیں۔ مجھے تو یوں بھی لگتا ہے کہ دمینتی کا پتا بھیم دیو اس خوف پر قابو پانے کی علامت ہے جس میں سے اس دھرتی نے جنم لیا ہے۔ دمینتی کی سہیلیوں کے نام میں نے اپنی تخلیقی قوت کے مطابق رکھے ہیں۔

اس ناٹک کو اسٹیج پر پیش کرنے کے بارے میں بہت سی دشواریاں محسوس کی جا سکتی ہیں مگر جیسا کہ میں پہلے بھی کئی بار کہہ چکا ہوں یہ دشواریاں اس امر کی مظہر نہیں ہیں کہ ناٹک میں اسٹیج پر کھیلے جانے کی کمی پائی جاتی ہے ـــــ یہ جو دشواریاں ہیں وہ ہمارے اسٹیج کی کوتاہیوں کا نتیجہ ہیں کیونکہ ہمارا اسٹیج ابھی قابل نہیں کہ کسی بھی وسیع منظر کو اس پر پیش کیا جا سکے۔ اگر تھوڑی سی سمجھ بوجھ سے کام لیا جائے تو راوی ان سب دشواریوں پر عبور حاصل کر سکتا ہے۔

بہت سے نقاد یہ اعتراض کریں گے کہ میں اپنی دیومالا کو جبراً مارکس وادی اور سماج وادی رنگ دے رہا ہوں ـــــ میں ان سے یہ التجا کروں گا کہ تاریخی یا دیومالائی واقعات کو ہر دور میں اُس دور کے نمائندہ فکر و خیال کے مطابق سمجھنے کی کوشش کرنا نہ صرف ضروری ہے بلکہ لازمی بھی ہے۔ زمانہ کے نمائندہ نقطۂ نظر کے سوا تاریخ یا دیومالا کے اور کوئی معنی ہو ہی نہیں سکتے۔ ہماری قدیم کہانیوں اور قصوں میں کرامات یا معجزہ کی بات ہی لے لیجیے۔ اگر ہم ان معجزوں کو جوں کے توں ان کے اصلی روپ میں کسی کردار کے ذریعہ بیان کرتے چلے جائیں گے تو ان میں اتحاد کی کمی کے باعث ان کی معنویت اور اہمیت کم ہوتی چلی جائے گی۔ دوامی قدر وہی ہے جس میں سے ہر دَور میں اس دَور کے خیالات کی رَو کے مطابق کوئی معنی نکلتے رہتے ہیں۔ جب کسی کہانی میں سے مطلوبہ معنی نکلنے بند

ہو جائیں تو اس کہانی کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔

میرا التماس ہے کہ ہمیں اپنے تاریخی اور دیو مالائی ورثے کو کسی بھی لحاظ سے بے معنی نہیں ہونے دینا چاہیے۔ اور اس میں مضمر دوامی قدروں کو حاصل کرنے کے لیے ہمیشہ کوشاں رہنا چاہیے۔

سنت سنگھ سیکھوں

کردار

دمینتی	ودربھ کی راجکماری
آشا کامنا کلپنا	دمینتی کی سہیلیاں
راجہ نل	نشدھ کا راجہ
منتری سچیتو	نشدھ کے راجہ کے مصاحب
اُروشی	راجہ نل کی قاصد
پُشکر	راجہ نل کا چھوٹا بھائی
بھیم	ودربھ کا راجہ، دمینتی کا باپ
اندر پون اگنی جل	دیوتا ——— دمینتی کو بیاہنے کے خواہاں

مصاحب، سہیلیاں وغیرہ

پہلا ایکٹ

راج بھون میں تالاب اور باغ۔ ایک کنج میں پھلوں سے لدے ہوئے پیڑوں کے نیچے ساڑھیوں میں ملبوس چار دوشیزائیں دکھائی دیتی ہیں۔ اُن میں سے ایک جو دوسری دوشیزاؤں سے زیادہ حسین ہے بہت باوقار ہے۔ یہ کماری دمینتی ہے۔ اور دوسری دوشیزائیں اس کی سہیلیاں — آشا، کامنا اور کلپنا — کلپنا کے ہاتھوں میں ایک ہنس ہے جو پر پھڑپھڑا رہا ہے۔ دمینتی کے ہاتھوں میں ایک خط ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں یہ خط ہنس کے پروں سے بندھا ہوا ملا ہے۔ اور اسے وہ پڑھ چکی ہے۔

دمینتی : کلپنا — یہ خط لکھنے والا نل راج کون ہوا؟

کلپنا : بھولی راجکماری جی! آپ نے ابھی تک نل راج کا نام بھی نہیں سنا — وہ تو ہمارے آریہ ورت میں ایک مشہور راجہ ہیں۔ لیکن شاید آپ جان بوجھ کر ان کی طرف سے اَن جان بن رہی ہیں۔

دمینتی : کلپنا — تم مجھ پر ہمیشہ اس طرح کے شک کیا کرتی ہو۔

کامنا : ہاں کماری جی — ! آپ جو کچھ کہیں کلپنا کو اس میں طنز نظر آتا ہے۔

دمینتی : میرے من کی بات تو اصل میں کامنا تم ہی کہتی ہو۔ کلپنا تو مجھے چڑاتی رہتی ہے۔

آشا : اور راجکماری جی میں؟

دمینتی : آشا تم بہت اچھی ہو — تم تو میری بھولی بھالی سہیلی ہو — تم مجھے من سے بھی زیادہ پیاری ہو — اور کامنا مجھے تم سے زیادہ اچھی لگتی ہے —

کامنا : ہاں کماری جی آپ نے تو ہم دونوں کی بات رکھ لی۔

کلپنا : جبھی تو میں کماری جی کو انجان ماننے کے لیے تیار نہیں۔ اور اسی لیے میں کماری جی کو تم دونوں سے کم پیاری ہوں —

دمینتی : پیاری تو تم بھی بہت ہو لیکن تم سے مجھے کوئی اَن جانا سا ڈر لگتا ہے۔ میں ڈرتی ہوں کہ تم

مجھے کسی الجھن میں نہ ڈال دو۔

کلپنا : یہی تو میں کہہ رہی ہوں کماری جی۔ آپ کو مجھ پر یقین نہیں۔ جہاں یقین نہ ہو وہاں پیار کیسے ہو سکتا ہے۔

دمینتی : کلپنا! ایک پیار اس قسم کا بھی ہوتا ہے جس میں کھُد بُدی لگی رہتی ہے جس میں یقین نہیں کیا جا سکتا۔

کلپنا : آپ کو یہ کھُد بُد کیسے محسوس ہوئی راجکماری جی۔

دمینتی : دیکھا — پھر وہی طنز سے بھری ہوئی بات! میں یہ کھد بد زیادہ محسوس نہیں کر رہی ہوں — جو کچھ میں نے کہا ہے — وہ پڑھے سنے کی بنیاد پر ہے — اور ہاں — تم سے بات چیت سے بھی کچھ اندازہ ہوا۔

کلپنا : تو پھر میں اس قسم کے پیار کو کیا کہوں۔؟

دمینتی : میں کہے دیتی ہوں — اور سچ ماننا کلپنا۔ یہ پیار بھی کسی انوکھی قسم کا ہے — مجھے تم سے ایسا پیار ہے کہ میں یہ کہہ سکتی ہوں کہ مجھے آشا اور کامنا سے جو پیار ہے وہ اس سے کم قیمت کا نہیں۔

کلپنا : آپ کا بہت بہت شکریہ کماری جی۔

دمینتی : (ہنستے ہوئے) تو پھر یہ بتاؤ کہ نل راج کون ہے —

کلپنا : نل راج نشدھ کا پُر جلال اور جواں سال حکمراں ہے۔ اس راجہ کے در پر میری موسی اور اس کا سارا خاندان پل رہا ہے — میں نے اُن سے اس راجہ کی جو تعریف سُنی ہے وہ اگر میں آپ کو بتاؤں تو آپ کو اعتبار نہیں آئے گا۔

کامنا : کماری جی — اب کلپنا کو نہ ٹوکیے گا۔ سنانے دیجیے اسے نل راج کی عظمت —

آشا : سناتی ہے تو سنائے۔ مگر ہماری کماری جی کے قابل کوئی ہوگا تو مانیں گے۔

دمینتی : (آشا کے کندھے پر پنکھا مارتے ہوئے) رہنے دے آشا — تم ہمیشہ ایسی ہی باتیں کیا کرتی ہو —

کلپنا : کماری جی — کرتی ہے تو کرنے دیجیے۔ آپ بھی اس دھرتی پر ایک عورت کے روپ میں بے مثال ہیں مگر مردوں میں نل راجہ جیسا بھی کوئی دوسرا آدمی ہوگا —

آشا : تو پھر کیا اس سے زیادہ خوبرو دیو لوک میں ڈھونڈنا ہوگا ہماری کماری جی کو۔؟

دمینتی : آشا۔ دیولوک کی بات نہ کرو۔ مجھے دیوتاؤں کے تئیں عقیدت سے زیادہ خوف محسوس ہوتا ہے۔
کلپنا : یہ اس لیے کماری جی کہ آپ اپنے آپ کو دیویوں سے بھی زیادہ بڑھ چڑھ کر محسوس کرتی ہیں۔
کامنا : بات ہے بھی ٹھیک۔ بھلا کون سی دیوی ہماری راجکماری کی برابری کر سکتی ہے ؟
دمینتی : کامنا! ایسی بات نہ کہو — دیویوں کے ایمان کے یہ الفاظ سُن کریں کانپنے لگی ہوں۔
کامنا : یہ کپکپی تو راجکماری جی تالاب میں نہاکر ہوا میں بیٹھنے سے لگنے ہی لگتی ہے —
کلپنا : کماری جی یہ تو پون دیوتا سے ہم آغوشی کا لطف ہے۔
دمینتی : لیکن اب مجھ سے یہ کپکپی برداشت نہیں ہوتی — سکھیو! تم سے برداشت ہو تو —
کلپنا : ہم نے کچھ موٹی ساڑھیاں پہن رکھی ہیں کماری جی۔
آشا : اگر سچ پوچھیے تو کانپ ہم بھی رہی ہیں۔
دمینتی : تو پھر —
کلپنا : اس کا علاج تو یہی ہے کہ پھر تالاب میں چلی جائیں۔ (ہنستے ہوئے) اصل میں اب آپ کے حُسن سے سرشار ہونے کی جل دیوتا کی باری ہے —
دمینتی : (اس کے کندھے پر پنکھا مارتے ہوئے) وہ تمہارے حُسن سے سرشار ہوئے کہ نہیں؟ اچھا چلو تالاب میں چلتے ہیں۔ آؤ کامنا — پھر تالاب میں دو غوطے لگالیں۔ لو — آشا تم یہ خط تھام لو —

(کامنا کا ہاتھ پکڑ کر اُسے تالاب میں لے جاتی ہے)

کلپنا : آشا — راجکماری جی اصل میں نل راج سے ملنا چاہتی ہیں۔
آشا : ٹھیک ہے۔ مگر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کماری جی نے نل راج کے بارے میں کچھ بھی نہ سُن رکھا ہو۔
کلپنا : تم سچ کہتی ہو۔ ہمارے سوا کماری جی نے اور کس سے اس کے بارے میں کچھ سننا اور جاننا تھا۔
آشا : کامنا نے شاید کچھ بتایا ہو۔

کلپنا : کامنا بھی کچھ خاص نہیں جانتی۔ نل راج کے بارے میں تو مجھے بہت معلوم ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ وہ صحیح معنوں میں کماری جی کا ہم رُتبہ نوجوان ہے ـــــ کماری جی کو اس کے بارے میں کچھ بتا دینا ہی بہتر ہے۔
آشا : تو تم بتاتی کیوں نہیں ہو ـــــ تمھیں کون روکتا ہے۔
کلپنا : تمہارا مشورہ لینا ضروری تھا آشا !
آشا : میری صلاح تو ہے کہ کماری جی کو نل راج کے بارے میں کچھ بتانا ہی کافی نہیں بلکہ اس کے متعلق کماری جی کی دلچسپی کو ہوا دینا ضروری ہے۔ وہ اٹھارہ برس کی ہو چکی ہیں اور اب ان کو نل راج یا کسی اور راجکمار میں دلچسپی لینی ہی چاہیے۔
کلپنا : بہت اچھا۔ میں اپنے اس ارادے کی تم سے تصدیق ہی چاہتی تھی۔ (پکارتے ہوئے) کماری جی اب آجائیے۔ جل دیوتا اب مطمئن ہو گئے ہوں گے۔ میں بھی ہنس کو تھامے ہوئے اکتا چکی ہوں ـــــ
دمینتی : (تالاب میں سے نکل کر آتے ہوئے) ہماری غیر حاضری میں کیا کھسر پھسر کرتی رہی ہو ؟
کلپنا : یہی کہ راجکماری کا تعارف نل راج سے کرا دیا جائے۔
دمینتی : (حیران ہو کر) تعارف ـــــ کیا نل راج یہاں کہیں آئے ہوئے ہیں ؟
کلپنا : آپ اتنی بیقرار کیوں ہوئی جا رہی ہیں ـــــ بلائے جائیں گے تو آ بھی جائیں گے۔
دمینتی : انھیں کون بُلائے گا ؟
کلپنا : ہم بلائیں گے اور کون !
آشا : ہم بلائیں گے اور کون !
کامنا : ہاں ـــــ ہاں ـــــ اب کسی راجکمار کو بُلانا ہی مناسب ہے۔ چلیے نل راج ہی سہی۔
دمینتی : کامنا ـــــ تم بھی ان سے مل گئیں ـــــ ؟ میں تو تمہیں آشا سے زیادہ معصوم سمجھ رہی تھی۔
کلپنا : کماری جی۔ ہم باری باری بھولی بھالی اور باری باری چتُر بن جاتی ہیں مگر آپ سدا سیدھی سادی رہتی ہیں۔
دمینتی : پھر وہی طنز ـــــ کلپنا کبھی تم سے میرا جھگڑا ہو جائے گا۔
کلپنا : آپ چاہے مجھ سے اب جھگڑیئے یا پھر کبھی مگر پہلے مجھے نل راج کے بارے میں کچھ کہہ لینے دیجیے۔

دمینتی : کچھ کہتی بھی نہیں ہو ــــ ہیر پھیر کیے جا رہی ہو۔

کلپنا : آپ کی دلچسپی ابھار ہی کچھ کہنا مناسب تھا ــــ اب وہ بات بن گئی ہے۔

دمینتی : تو کہو کیا کہتی ہو ــــ

کلپنا : لیجیے سنیے۔ یہ نل راج نشدھ راج کے مہاراج ادھیراج ہیں۔

دمینتی : یہ تو تم پہلے ہی بتا چکی ہو ــــ

کلپنا : (ہنستے ہوئے) اچھا تو آپ نے یہ بات یاد رکھی ہوئی ہے۔ پھر تو مجھے یہ امید رکھنی چاہیے کہ میں جو کچھ کہوں گی وہ آپ کے دل و دماغ پر نقش ہو جائے گا۔

کامنا : اب زیادہ باتیں نہ بناؤ۔ جو کچھ جانتی ہو کہہ ڈالو۔

کلپنا : نل راج اونچے لمبے، گورے چٹے، خوبرو، سڈول اور لگ بھگ بیس سال کے نوجوان ہیں۔

آشا : کیوں نہیں۔ آخر راجکمار ہیں!

کلپنا : دھرم گیان میں کامل، شستر ودیا کے دھنی، دھرم شاستر اور راج شاستر کے ماہر۔ مختصر یہ کہ جسمانی لحاظ سے جتنے تندرست ہیں اتنا ہی ان کا دل و دماغ بھی روشن ہے۔

دمینتی : تو بڑی تعریف کی ــــ ایسے تو سبھی راجکمار ہوتے ہی ہیں۔

کامنا : ان سب میں انوکھی بات کیا ہوئی ؟

کلپنا : پہلے خوبصورتی کا سطحی بیان ضروری تھا کامنا ــــ اب امتیازی شان کی طرف بھی آتی ہوں ــــ

آشا : ہماری راجکماری پر امتیازی خصوصیت کے بغیر نل راج یا کسی اور راجکمار کا اثر ہونے سے رہا۔

کلپنا : نل راج میں بے نظیر اور لاثانی اوصاف بھی بہت ہیں۔ وہ بڑے بلوان اور غضب کے تیر انداز ہیں۔ تیر اندازی میں ورن دیوتا کو کئی بار شکست دے چکے ہیں۔

دمینتی : اچھا ــ ایسے تیر انداز کہ ورن دیوتا بھی ان سے ہار گئے ؟

کلپنا : ہاں راجکماری جی ــ تیر اندازی میں ورن دیوتا بھی ان سے خم کھاتا ہے۔

آشا : راجہ نل کا یہ عظیم وصف ہے ــ لیکن ہماری راجکماری تو اس سے بھی بڑے وصف سے

متاثر ہونے والی ہیں۔

کلپنا : ایسے تیراک ہیں کہ ایک ہی جست میں ندی دریا پار کر جاتے ہیں —— ان کے بازوؤں میں اتنی طاقت ہے کہ ندی کا بہاؤ روک دیتے ہیں اور اس کے پانی کو سمندر کی طرف سے موڑ کر کھیتوں میں ڈال دیتے ہیں۔

آشا : پھر تو ان کی سلطنت میں ترکاریوں، پیڑ پودوں، پھلوں اور اناج کی کوئی کمی نہیں ہو گی۔

کلپنا : نشدھ کی رعایا بہت خوشحال ہے۔ ان کو خوراک، پانی، کپڑے اور مکان کی کوئی کمی نہیں۔

دمینتی : اچھی بات ہے۔ نشدھ کی رعایا کو اگر یہ آسائشیں حاصل ہیں تو اس میں حیرت کی کون سی بات ہے۔ راج کا دھرم یہی ہے کہ وہ اتنا کچھ تو کرے۔

کلپنا : ہمارے ودربھ میں ......

دمینتی : (بات کاٹتے ہوئے) ہمارے ودربھ میں ندیوں کا بہاؤ موڑ کر کھیتوں کی سینچائی کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ ہمارے یہاں تو برسات ضرورت سے زیادہ ہوتی ہے۔

آشا : ہاں —— ہم پر اندر دیوتا کا بہت کرم ہے۔

کلپنا : اندر دیوتا کے رحم و کرم پر رہنا تو عقلمندی نہیں آشا —— اندر دیوتا کا کیا بھروسہ۔ نہ جانے کب غصے میں آ کر دھرتی کو پانی میں ڈبو دے —————— اور رعایا کو تباہ و برباد کر دے، ہلاک کر دے۔ اور پھر وہ اہلیہ کی بات.......

دمینتی : کیا۔ اہلیہ کی بات —— اگر وہ مجھ سے یہ جرأت کرے تو میں نناخنوں سے اس کا منہ نہ پھیر دوں ——

کلپنا : یہ تو وقت ہی بتائے گا۔ ہم دیوتا کو اس طرح کیوں للکاریں۔

کامنا : یہ للکار نہیں کلپنا —— تم نے خواہ مخواہ اہلیہ کا ذکر کر کے کماری جی کو ناراض کر دیا۔

دمینتی : (کچھ ڈرتے ہوئے) اچھا اس بات کو چھوڑو اور آگے بڑھو۔

کلپنا : ایسے صنّاع ہیں کہ وہ اگن رتھ بنانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اگن بان تو نل راج نے کئی قسم کے بنا رکھے ہیں اور ان کی سلطنت میں پہاڑ چونکہ دور ہیں اس لیے لوگ

اپنے گھروں کی دیواروں کے واسطے اینٹیں بنانا جانتے ہیں۔ انھوں نے ایسا سامان ایجاد کر رکھا ہے جس سے وہ اینٹیں پکا کر اس کو لال پتھر جیسا کر لیتے ہیں۔ مختصر یہ کہ انھوں نے اگنی دیوتا کو جیسے اپنے بس میں کر رکھا ہو۔

کامنا : ہمارے ودربھ میں پتھر اتنا عام ہے کہ ہمیں اینٹیں پکانے کی ضرورت ہی نہیں۔

آشا : لیکن ہمیں یہ فن تک تو نہیں آتا۔

دمینتی : اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ راجہ نل نے ورن، جل اور اگنی تینوں دیوتاؤں کو شکست دے رکھی ہے ——

کلپنا : اور نہیں تو کیا۔

دمینتی : پھر تو وہ بڑی شان و شکوہ والا راجہ ہے۔

کلپنا : حقیقت یہی ہے۔

کامنا : مگر اندر دیوتا سے ان کے کیسے تعلقات ہیں؟ اگر اندر دیوتا کو ہرایا ہو تو پھر ہم مانیں۔

کلپنا : اندر دیوتا کو کون انسان شکست دے سکتا ہے؟ دیوتا بھی اندر دیو کے ماتحت ہیں اور اس کو اپنا راجہ مانتے ہیں۔

آشا : اندر دیوتا کی عظمت کو تسلیم نہ کرنا تو راکشس جیسی خودسری ہے۔

کلپنا : جو بھی انسان اندر دیوتا کی عظمت کو نہ ماننے کی جرأت کرے گا ذلیل ہوگا —— اندر دیوتا کی عظمت کو تو بھگوان برقرار رکھتے ہیں۔

دمینتی : میں تو اس مرد سے شادی کروں گی جو اندر دیوتا کی عظمت کو تسلیم نہ کرے اور اس کے آگے گڑگڑائے نہیں۔

کلپنا : (کچھ اداس لہجے میں) راجکماری جی —— اگر آپ راجہ نل کو اکسائیں تو شاید وہ اندر دیوتا کی عظمت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیں۔

کامنا : یہی بات ہماری راجکماری کو حاصل کرنے کے لیے راجہ نل کی آزمائش ثابت ہوگی۔

دمینتی : (فخر سے) ہاں —— میں راجہ نل کو اندر دیوتا کا منکر بنا دوں گی۔

کلپنا : (ہنستے ہوئے) پہلے راجہ نل سے شادی تو کر لیجیے راجکاری جی —— پھر اُن سے کچھ بھی کرا لیجیے۔

دمینتی : (شرمسار ہنسی کے ساتھ) ہاں —— یہ بات تو میں بھول ہی گئی تھی —— شاید سوئمبر میں

راجہ نل کو میں حاصل نہ کرسکوں ——

کلپنا : یا وہ خود ہی سوئمبر میں کسی وجہ سے شامل نہ ہوسکیں۔

کامنا : کیا یہ ممکن ہے کہ راجکماری دمینتی جی کا سوئمبر رچا ہوا ہو اور راجہ نل اس میں شرکت نہ کریں۔

آشا : نہیں، یہ ممکن نہیں۔ راجہ نل سوئمبر میں شامل ہوں گے اور راجکماری جی انہیں حاصل کرلیں گی ——

کلپنا : میرے کہنے کا مطلب کچھ اور تھا۔

کامنا : کیا تم جانتی ہو کہ اس خط میں راجہ نل نے کیا لکھا ہے —؟

کلپنا : میں بوجھ تو سکتی ہوں۔ اگر تم بتا دو تو زیادہ مناسب ہوگا۔

کامنا : راجہ نل نے اس خط میں اپنی محبت بھری حالت بیان کی ہے۔

کلپنا : ہنس کے ذریعہ کوئی اور سندیسہ بھیجا بھی کیسے جا سکتا تھا — مجھے یہ معلوم تھا۔ مگر میں تمہاری زبان سے کہلوانا چاہتی تھی کامنا —— ہماری راجکماری اس بات پر چپ کیوں ہیں؟ ان کی آنکھیں جھک کیوں گئی ہیں۔

آشا : جھکیں نہ تو کیا کریں۔ راجہ نل نے محبت بھری التجائیں کی ہوں گی۔

کلپنا : راجکماری جی سکھیوں سے کیسی شرم! ہمیں سب کچھ معلوم ہے —— مگر ہم آپکے لرزتے ہوئے لہجے میں یہ کہانی سننا چاہتی ہیں۔

دمینتی : تم کیا سننا چاہتی ہو —— یہ محبت بھری التجائیں نہیں، محبت کے تیر ہیں سکھیو —— راجہ نل محبت کے تیروں سے بندھے ہوئے ہیں ہی مگر اب میں بھی محبت کے تیر سے بندھ گئی ہوں۔

کلپنا : بس ایک خط سے آپ کی یہ حالت ہوگئی راجکماری جی؟ (سمجھتے ہوئے) اس خط کے پیچھے شاید کوئی اور بھید بھی ہے۔

دمینتی : (کچھ چڑ کر) ہاں —— شاید کوئی اور بھید بھی ہے —— اور وہ بھید یہ ہے کہ راجہ نل نے میرا ہنس پکڑ لیا ہے اور اسے اپنے پاس رکھ کر اپنا ہنس ادھر بھیجا ہے

آشا : ان کا ہنس یہاں کیسے آگیا؟

دمینتی : اسی بات پر میں حیران ہوں ——

کلپنا : آپ کا ہنس ان کے باغ میں کیسے چلا گیا ؟

دمینتی : میں نے اس ہنس کے ذریعہ کوئی سندیسہ نہیں بھیجا تھا۔ میرا ہنس تو یوں ہی اڑتا اڑتا ان کے باغ میں چلا گیا۔

کلپنا : اور شاید ان کا ہنس بھی اڑتا اڑتا اِدھر چلا آیا۔

دمینتی : مگر یہ خط کیسے لے آیا ؟

کلپنا : یہی تو نل راج کی کرامات ہے۔ انھوں نے مختلف پردیشوں کی طرف جانے والے مختلف ہنس سدھار کھے ہیں۔ ودربھ کی طرف آنے کی تربیت پایا ہوا ہنس یہ خط لے آیا۔

دمینتی : لیکن اس ہنس کو اگر کوئی شاہی ہرکارہ پکڑ کر پتا جی کے پاس لے جاتا تو......

کلپنا : پھر کیا ہوتا ــــ اس میں صرف محبت بھری التجا ہی تو ہے ــــ مہاراج بھیم سین اس التجا کو کب نامناسب سمجھتے اور ویسے بھی راجہ نل جیسے داماد آسانی سے تو نہیں ملتے۔

دمینتی : (خوش ہو کر) مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے تم میری نہیں راج نل کی سکھی ہو۔

کلپنا : سکھی تو میں آپ کی ہوں اور آپ کے ذریعہ راج نل راج کی سکھی بننے کی خواہش رکھتی ہوں ــــ اُمید ہے کہ میری یہ خواہش جلد پوری ہو جائے گی۔ (آنکھیں مٹکاتے ہوئے) راجکماری جی۔ آپ کا ہنس بھی اکیلا نہیں گیا ہوگا۔ کسی سدھائے ہوئے ہنس کے ہمراہ گیا ہوگا۔

دمینتی : ہاں۔ چوری چھپے نہیں۔ پتا جی نے اپنا ودربھ والا ہنس کسی وجہ سے ادھر جانے کے لیے چھوڑا تھا۔ میں نے بھی اپنا ہنس اس کے ساتھ چھوڑ دیا۔ مذاق میں۔ میں نے کوئی سندیسہ تو نہیں بھیجا تھا۔

کلپنا : آپ کا ہنس بجائے خود ایک پیغام تھا۔

دمینتی : (مچلتے ہوئے) ہاں ــــ ہاں ــــ تم تو بہت کچھ کہو گی۔

کلپنا : (داسی انداز میں) نہیں۔ میں بہت کچھ تو نہیں کہتی مگر صرف اتنا پوچھتی ہوں کہ اب آپ وہ اپنا ہنس واپس کیسے بلوائیں گی ؟

دمینتی : تم ہی بتاؤ کہ اُسے کس طریقہ سے واپس بلواؤں۔

کلپنا : اس ہنس کے پروں سے خط باندھ کر بھیجیے۔ خط میں ہنس کو چھوڑ دینے کی درخواست کیجیے۔

کامنا : کیوں نہ ہم اس ہنس کو اس وقت تک روکے رکھیں جب تک کہ راجہ نل ہمارا ہنس نہیں لوٹاتے۔

دمینتی : ہاں — ہاں — یہ بھی ٹھیک ہے۔

کلپنا : اصل میں راجکماری جی آپ یہ چاہتی ہیں کہ آپ کے خط بھیجنے سے پہلے راجہ نل آپ کو ایک اور خط بھیجے — وہ اپنا خط آپ کے ہنس کے ذریعہ بھیج سکتے تھے۔ آپ نے اپنا ہنس خط لانے کے لیے تو وہاں بھیجا تھا۔

دمینتی : دیکھا۔ تم طنز کرنے سے باز نہیں آتی ہو۔

کلپنا : لیکن انھوں نے اپنی ہوشیاری دکھائی۔ اب وہ آپ سے خط طلب کر رہے ہیں۔

کامنا : تو کیا راجکماری جی کو خط بھیجنا چاہیے ؟ میری رائے میں تو اپنا ہنس واپس منگوانے کے لیے ایک خط بھیجنے میں کوئی برائی نہیں۔

کلپنا : نہیں۔ کوئی برائی نہیں۔

دمینتی : تمہارے من میں کوئی شک ہے۔ تم بتاتی کیوں نہیں ہو۔

کلپنا : میں یہی سوچ رہی ہوں کہ راجہ نل نے آپ کے ہنس کے ذریعہ خط کیوں نہ بھیجا۔ اپنا ہنس کیوں بھیجا — ؟ ان کا بھیجا ہوا خط کسی اور کے ہاتھ بھی لگ سکتا تھا۔ — کوئی ہنگامہ کھڑا ہو سکتا تھا۔

آشا : کیسا ہنگامہ ؟ ایسی بات نہیں۔ راجہ نل نے تو اپنی ہوشیاری اور اپنی انتظامیہ چابکدستی کا ثبوت دینا چاہا ہے۔

کلپنا : لیکن یہ بات اُن کے اس رجحان اور کمزوری کی آئینہ دار بھی ہو سکتی ہے جو میں اب کہنا چاہتی ہوں۔

آشا : کیا — کیا اس میں کوئی اتنا بڑا عیب بھی ہے ؟

کامنا : اندھا، کانا، لولا لنگڑا اور بیوقوف نہ ہو۔ ایک راجہ میں ان کے سوا اور کیا عیب ہو سکتا ہے۔

کلپنا : ان کو جوا کھیلنے کی لت ہے۔

دمینتی : کیا جوا کھیلنے کی!
کلپنا : ہاں ــــ جوا کھیلنے کی۔
آشا : جوا تو راجوں کا کھیل نہیں بلکہ شغل ہے۔ جتنا بڑا راجہ اتنا ہی بڑا جواری۔
کامنا : ہاں ــــ کوئی کنگال تھوڑے ہی جوا کھیل سکتا ہے۔ یہ تو راجوں کا ہی کھیل ہے۔
دمینتی : مجھے تو جوئے سے ڈر لگتا ہے۔ (کانپ اٹھتی ہے) دیکھو۔ جوئے کے نام سے میرے بدن میں کپکپی چڑھ گئی ہے۔
کلپنا : (ہنستے ہوئے) یہ کپکپی جل دیوتا کی پیدا کی ہوئی ہے شاید۔ آپ دیر تک پون دیوتا کی آغوش میں بیٹھی رہی ہیں اس لیے جل دیوتا حسد کی آگ میں جل رہا ہے۔
آشا : آئیے۔ راجکماری جی۔ اس بار میں آپ کے ساتھ تالاب میں نہاؤں گی۔
دمینتی : تو آؤ چلو ــــ

(دونوں تالاب میں چلی جاتی ہیں)

کامنا : جو آدمی جُوا نہیں کھیلتا کلپنا وہ آدمی کہاں ہے ــــ وہ محبت میں کیا تیر مارے گا ــــ محبت بھی تو ایک جُوا ہے۔
کلپنا : مگر پریم میں ہار نہیں ہوتی کامنا ــــ جیت ہی جیت رہتی ہے۔
کامنا : وہ کیسے کلپنا؟ بہت سے راجہ راجکماری جی کے سوئمبر میں آئیں گے راجکماری تو صرف ایک ہی کے گلے میں جے مالا ڈالیں گی۔ دوسروں کی یہ ہار نہیں ہوگی اور کیا ہوگا؟
کلپنا : اول، مگر سب راجکماری کے عاشق تو نہیں ہوں گے۔ کئی راجے تو جیتنے کی غرض سے آئیں گے۔ اگر وہ جیت نہیں سکیں گے تو وہ ہار بھی نہیں مانیں گے اگر کوئی سچّا عاشق ہوگا تو وہ راجکماری جی کی مرضی کے آگے سر جھکا کر اپنے من کو سمجھائے گا ــــ
کامنا : اس طرح تو ہارا ہوا جواری بھی اپنے من کو سمجھا سکتا ہے۔
کلپنا : ہارنے والے کو جیتنے والے سے کوئی ایسی محبت اور یگانگت نہیں ہوتی جو ایک عاشق کو اپنی محبوبہ سے ہوتی ہے۔
کامنا : یہ محض آدرش ہے کلپنا۔ ہم تو محبت کو بھی جوا سمجھتے ہیں اور جوئے کو بھی جوا ــــ دونوں میں ہار بری ہوتی ہے ــــ لیکن ہار ہو جائے تو کوئی کیا کر سکتا ہے۔ ویسے یہ دونوں کھیل کھیلنے ضرور چاہئیں۔

کلپنا : کیا تم بھی کھیلو گی ـــ ؟

کامنا : میں تو راجوں کی بات کر رہی ہوں ۔ موقع ملا تو میں بھی کوئی کسر نہیں اٹھا رکھوں گی ۔

کلپنا : اچھا کامنا ۔ یہ ذکر چھوڑو ۔ آؤ راجہ نل اور دمینتی کے بارے میں کچھ سوچیں ۔

کامنا : کیا سوچیں ۔ ان کی جوڑی خوبصورت ہے ۔ ان کی شادی کرانے کے لیے ہمیں پورا زور لگا دینا چاہیے ۔

کلپنا : اتنا زور لگانے کی ضرورت ہی کیا ہے ـــ راجکماری تو دل سے خود یہی چاہتی ہیں ـــ ماں باپ تو راجکماری کی خوشی میں اپنی خوشی سمجھتے ہیں ـــ اور ان کو کوئی جھجک نہیں ہونی چاہیے ۔ راجہ نل جیسا قابل بر راجکماری کے لیے سارے بھارت ورش میں نہیں ہے ۔

کامنا : اری ـــ اتنے غرور کی بات نہ کرو ۔ دیوتاؤں کا حسد جاگ اٹھتا ہے ۔ جب انسان کا کوئی ثانی نہ ہو تو دیوتا اس کے پیچھے پنجے جھاڑ کر پڑ جاتے ہیں ۔

کلپنا : بات تو تمہاری سچّی ہے کامنا ـــ اگر اندر دیوتا کا رجحان اِدھر ہو گیا تو سب کو لینے کے دینے پڑ جائیں گے ۔

کامنا : تو پھر سوئمبر جلد رچانے پر اسے رضامند کر لو ۔

(کلپنا کے ہاتھ میں ہنس اپنے پر پھڑپھڑاتا ہے)

کلپنا : (پکارتے ہوئے) راجکماری جی ہنس اب بہت بیقرار ہوا جا رہا ہے ۔ اس طرح پھڑپھڑاتا رہا تو میرے ہاتھوں سے چھوٹ جائے گا ۔ جلدی آیئے ۔ اگر اس کے ذریعہ کسی کو سندیسہ بھیجنا ہے تو ......

کامنا : (اس کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے) اری ـــ اتنے زور سے کیوں چیخ رہی ہے ۔ دیوار کے بھی کان ہوتے ہیں ۔

(دمینتی اور آشا تالاب سے نکل کر آتی ہیں)

دمینتی : (جھلّا کر) یہ کیا شور مچا رکھا ہے تم نے کلپنا ـــ ؟ کامنا سے تو میں اس قسم کی بیتابی کی توقع کر سکتی ہوں مگر تم کیوں اس کی طرح بیقرار ہو گئی ہو ۔

کلپنا : (ہنستے ہوئے) محبت میں راجکماری کلپنا (تصور) کامنا (خواہش) کی طرح بیقرار ہو اٹھتی ہے ۔

دمینتی : کیسا پریم — پریم کا روگ کیسے ہو گیا ہے ؟
کلپنا : کلپنا کو، آشا کو، کامنا کو اور ان کی مالکن کو —
دمینتی : (پنکھا اٹھا کر اس کے منہ پر دے مارتی ہے) مالکن اتنی کچّی نہیں۔
کلپنا : پک کب گئی ؟ ابھی تو مشکل سے سولہ برس کی ہوئی ہے۔
دمینتی : اچھا زیادہ باتیں نہ بناؤ۔ کرتا ہو تو کام کی بات کرو۔
کلپنا : کام کی بات یہی ہے کہ ہنس کے ذریعہ خط بھیجو۔ یہ بہت بیقرار ہوا جا رہا ہے۔
(کلپنا کے ہاتھ میں ہنس پھڑپھڑاتا ہے)
دمینتی : (کامنا سے) جاؤ۔ کامنا۔ اس کنج میں پڑا ہوا کورا پتر لے آؤ۔
آشا : خط تو راجکماری جی آپ نے پہلے ہی لکھ رکھا ہو گا۔
دمینتی : کورا کاغذ بھیج دیا جائے گا — مجھے اس پر کیا لکھنا ہے۔
کلپنا : ہاں۔ کورا کاغذ سمجھنے والے کو زیادہ مناسب سندیسہ دے گا۔
دمینتی : ہاں۔ ہنس کے پر میں کورا کاغذ باندھ دیتے ہیں۔ جس کا جو جی چاہے سمجھ لے — ہم تو کسی طرح نہیں پکڑے جائیں گے نا —
کلپنا : راجکماری جی مگر آپ کی خواہش کیا ہے ؟
دمینتی : میں نے ابھی کچھ طے نہیں کیا۔
(چپکے سے کچھ کہنا چاہتی ہے مگر سکھیوں سے وہ کچھ چھپا نہیں سکتی —)
کلپنا۔ سب سے پہلے تو میں راجہ نل سے علیحدگی میں ملنا چاہتی ہوں — اس کے بعد ہی کوئی فیصلہ کر سکتی ہوں۔
کلپنا : لیکن سوئمبر رچانے کے لیے تو مہاراج سے درخواست کر دو —
دمینتی : اتنی جلدی کیا ہے — ؟
کلپنا : نہیں۔ راجکماری جی سوئمبر کا پہلا اعلان ہو جانا چاہیے تاکہ راجہ نل کی خواہش شدّت پکڑ جائے۔
دمینتی : جیسا تم مناسب سمجھتی ہو کر لیا جائے گا۔
کلپنا : علیحدگی میں ملاقات کے لیے راجہ نل کو سندیسہ کس ڈھنگ سے بھیجا جائے۔ خط میں

یہ لکھنا مناسب نہ ہوگا۔

کامنا: (کنج میں سے کورا کاغذ لاتے ہوئے) ہاں پتر تو کورا ہی جانا چاہیئے۔

کلپنا: اچھا — میں خود راجہ نل کے پاس پیغام پہنچادوں گی۔

آشا: میں بھی یہ خدمت سرانجام دے سکتی ہوں ——

دمینتی: نہیں آشا — نہیں۔ تم میرے دل کی بات کو بڑھا چڑھا کر پیش کردو گی۔ تم تو ہمیشہ بے چین اور بیکل رہتی ہو۔ سندیسہ پہنچانے میں کلپنا ہی ٹھیک رہے گی۔

کامنا: راجہ نل کے دربار میں اس کی پہلے ہی کچھ جان پہچان بھی ہے۔

کلپنا: اچھا تو یہ طے پاگیا۔ لاؤ اب یہ کاغذ ہنس کے پر سے باندھ دیں۔

(آشا کامنا سے کورا پتر لے کر ہنس کے پر میں باندھ دیتی ہے اور پھر کلپنا سے ہنس لے لیتی ہے۔)

آشا: راجکماری جی۔ اب ہنس کو چھوڑ دوں ؟

کلپنا: نہیں راجکماری کو اپنے ہاتھوں سے چھوڑنے دو۔

(آشا راجکماری کو ہنس تھمادیتی ہے اور دمینتی ہنس پر پیار کی ایک نظر ڈال کر اسے چھوڑ دیتی ہے)

پردہ

دوسرا ایکٹ

راجہ نل کے راج بھون کا ایک حصّہ۔
راجہ نل اور اس کا نجی منتری آتے ہیں۔

راجہ نل: منتری جی۔ آج کی ڈاک میں راجکماری دمینتی کے سوئمبر کی خوشخبری موصول ہوئی ہے۔

منتری: جی مہاراج۔ سوئمبر کی اطلاع نہ کہیے۔ بلکہ اسے تو ابتدائی شگن اور ناطہ کہیے۔

راجہ نل: (ہنستے ہوئے) آشاوادی (رجائیت پسند) ہونا ایک اچھا وصف ہے مگر زیادہ بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔

منتری: یہ حد سے زیادہ اعتماد نہیں مہاراج — آپ کے سندیسے کا ہی تو یہ نتیجہ ہے۔

راجہ نل: (اندر ہی اندر خوش ہوکر) میرا سندیسہ ان کے سندیسے کا جواب ہی تھا۔ پہلا سندیسہ تو راجکماری کا آیا تھا۔

منتری: یہ بھی ٹھیک ہے۔ پیاسا ہی کنوئیں کے پاس چل کر آتا ہے۔

راجہ نل: لیکن کنوئیں کو بھی پیاسے کی ضرورت ہوتی ہے۔ منتری جی۔ ویسے یہاں کنوئیں اور پیاسے والی بات کا کوئی تعلق نہیں۔ یہاں تو دھرتی اور انسان کا تعلق ہے۔

منتری: ٹھیک ہے مہاراج — آپ اپنے منتری سے زیادہ دانشمند ہیں اور شاعرانہ ادراک رکھتے ہیں۔ آپ کے سامنے منتری کی کیا بساط — کئی بار دھرتی کسان کے لیے پہلے سے تیار نہیں ہوتی۔ اسے تیار کرنا پڑتا ہے۔ جیسے جنگل کاٹ کر زمین کو قابل کاشت بنایا جاتا ہے۔

راجہ نل: یہ بھی کوئی الٹی بات نہیں۔ آپ نے جو کہا ہے اس کے مطابق دھرتی کسی آفت اور مصیبت میں جکڑی ہوئی ہوتی ہے اور کسان کو اسے نجات دلانی پڑتی ہے — مگر یہاں تو دھرتی ہر طرح سے کنواری ہے —

منتری: اور کسان بھی تو جواں سال ہے۔

راجہ نل: اور اس کسان میں ذہانت ہے، قابلیت، عقل اور طاقت ہے۔ ٹھیک؟ (ہنستا ہے)

جانتے ہو۔ میں کیوں ہنس رہا ہوں ؟

منتری: اس لیے مہاراج ــــ کہ مالک کے بارے میں جو باتیں مجھے کہنی چاہیے تھیں مگر میری کاہلی کے باعث، یہ باتیں مہاراج کو ہی کہنی پڑگئیں۔

راجہ نل: یا یہ سمجھ لیجیے کہ مہاراج اس دھرتی کے دولھا بننے کے لیے بہت بیقرار ہیں۔

منتری: آپ نے درست فرمایا ــــ عمر کے لحاظ سے بھی آپ اس کے حقدار ہیں۔

راجہ نل: کیا میری بیقراری کی وجہ صرف یہی ہے ــــ ؟

منتری: نہیں مہاراج ــــ اور اس کی وجہ وہ تصویر بھی ہے جو آپ کی اور راجکماری دمینتی دونوں کی سانجھی سکھی نے بھیجی ہے۔

راجہ نل: منتری ــ کیا تصویر دیکھ کر کوئی فیصلہ کرنا مناسب ہوگا ؟

منتری: آپ کی سکھی کوئی دھوکہ نہیں دے سکتی اور اس سے کوئی خطا نہیں ہوسکتی۔

راجہ نل: کلپنا سے بھول ہوسکتی ہے دھوکہ چاہے نہ دے۔

منتری: پھر اس کا کیا علاج ــــ ؟

(راجہ نل ہنستا ہے۔)

منتری: مہاراج اس مسئلہ کو حل کرنے میں تو میں اُپ منتری ہوں ــــ مکھیہ منتری تو مہاراج کا اپنا دل ہے۔

راجہ نل: میرا دل تو یہ گواہی دیتا ہے کہ سوئمبر سے پہلے ایک بار راج کماری سے چوری چھپے ملاقات کرنی چاہیے۔

منتری: یعنی کسان کو پہلے جاکر دھرتی دیکھ آنی چاہیے۔ مگر مہاراج یہ بات راجوں کو زیب نہیں دیتی۔

راجہ نل: کیوں ؟

منتری: اس لیے کہ راجہ کو صرف ایک ہی دھرتی کا مالک نہیں بننا ہوتا ہے۔ اگر اسے ایک قطعہ آراضی پسند نہیں آئے گا تو اسے دوسرا حاصل کرنا ہوگا۔

راجہ نل: جس دھرتی پر اپنی انفرادیت کا محل تعمیر کرنا ہو اس کے بارے میں راجہ کو بھی زیادہ چوکس ہونا چاہیے۔

منتری: مہاراج ــ راجوں کو انفرادیت کی کیا ضرورت ؟

راجہ نل: (ہنستے ہوئے) کیوں؟ کیا راجے وزیروں کے اشاروں پر ناچنے والی کٹھ پتلیاں ہوتے ہیں۔

منتری: وزیروں کی کٹھ پتلیاں نہیں مہاراج۔ راجے رعایا کی کٹھ پتلیاں ہوتے ہیں۔ راجہ لوگ رعایا کے جذبات و محسوسات کی نمائندگی کرنے والی پتلیاں ہی ہوتے ہیں۔

راجہ نل: تو پھر شاید اپنی انفرادیت سے ہاتھ دھو بیٹھنا راجوں کا طبقاتی فرض ہوا؟

منتری: مہاراج۔ آپ تو جانتے ہی ہیں۔

(دروازے پر دستک)

راجہ نل: آجائیے ——

(ایک باندی آتی ہے —)

باندی: مہاراج —— آپ سے ملاقات کے لیے ایک بہت ہی خوبصورت عورت آئی ہے۔

راجہ نل: (ہنستے ہوئے) بہت ہی حسین عورت!

باندی: ہاں مہاراج —— شاید یہ وہی سکھی ہے جو کچھ عرصہ پہلے یہیں راج دربار میں ہوا کرتی تھی ——

راجہ نل: کلپنا۔

باندی: نام تو مہاراج یہ باندی جانتی نہیں —یہ انگوٹھی اس کی نشانی ہے۔

راجہ نل: (انگوٹھی دیکھ کر) ٹھیک ہے۔ بھیج دو۔

منتری: مہاراج —کیا میں یہاں سے چلا جاؤں؟

راجہ نل: نہیں —ہم آپ کی موجودگی ہی میں کلپنا سے بات کریں گے۔

(کلپنا آتی ہے)

کلپنا: پرنام مہاراج۔

(کلپنا آگے بڑھ کر اپنا سر جھکا دیتی ہے — راجہ نل اُسے کندھے سے پکڑ کر ایک خالی نشست پر بٹھانے کے لیے لے جاتے ہیں ور اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہیں۔ کلپنا کھڑی رہتی ہے —— منتری کلپنا کی طرف دیکھتا ہے تو وہ اسے بھی ہاتھ جوڑ کر نمسکار کرتی ہے)

راجہ نل: کیسے آنا ہوا کلپنا ؟

کلپنا: مہاراج کی عظمت داسی کو یہاں لے آئی۔ گستاخی معاف ـــــ میں ایک پیغام لائی ہوں اور گزارش کروں گی کہ میں جو پیغام لائی ہوں اس کا دوسرے کے کان تک پہنچنا پیغام بھیجنے والے کی توہین کے برابر ہو گا۔

(راجہ نل ہنستا ہے)

منتری: مہاراج میں نے تو پہلے ہی رخصت چاہی تھی۔ (اٹھ کر جانے لگتا ہے)

راجہ نل: منتری جی ـــ دور نہ جائیے گا ـــ ہمیں آپ کے مشورے کی ابھی ضرورت پڑے گی۔

منتری: (جاتے ہوئے) میں ساتھ کے کمرے میں آپ کے حکم کا منتظر رہوں گا۔ (جاتا ہے)

راجہ نل: (مسکراتے ہوئے) ہاں کلپنا ـــــ وہ پیغام کیا ہے ؟

کلپنا: مہاراج ـ کیا پہلے آپ مجھے یہ بتانے کی زحمت گوارا کریں گے کہ میری بھیجی ہوئی تصویر کا آپ کے دل پر کیا اثر ہوا ؟

راجہ نل: تصویر کسی پری جمال دوشیزہ کا عکس ہے۔

کلپنا: مہاراج۔ راجکماری اس تصویر سے بھی زیادہ خوبصورت ہے ـــ ان کے بے مثال اوصاف ذہن و دل اور عقل و دانش کی عکاسی اس تصویر میں نہیں کی جا سکتی تھی۔

راجہ نل: کلپنا ـــ راجکماری ہیں دل و دماغ کے بے مثال اوصاف بھلا کیا ہو سکتے ہیں۔ عورت تو قدرت ہوتی ہے۔ کیا اس میں ذہن و دل کے اوصاف ڈھونڈنا ہوا میں تیر مارنے کے برابر نہیں ؟

کلپنا: تو پھر مہاراج کو اس تصویر میں پیش کی گئی خوبصورتی پر مطمئن ہو جانا چاہیے۔ ظاہری حسن سے آپ نے جو اندازہ لگایا ہے راجکماری اس سے بھی زیادہ حسین ہے۔ چونکہ میری مصوری ابھی پختہ نہیں ہے۔ پھر بھی مہاراج ......

راجہ نل: پھر کیا ؟

کلپنا: مہاراج۔ گزارش یہ ہے کہ عورت قدرت نہیں ہوتی۔ قدرت کو عورت سے تشبیہ دی جا سکتی ہے ـــ

راجہ نل: بات کو یوں الٹ دینے سے کیا فرق پڑتا ہے ـــ ؟

کلپنا: بڑا فرق پڑتا ہے ـــ مہاراج ان باتوں میں آپ انجان نہیں مگر میرے منہ سے کہلوانا

چاہتے ہیں۔

راجہ نل: یوں ہی سہی۔

کلپنا: انسان قدرت میں ذہن ودل کے اوصاف کو فروغ دینا اور واضح کرنا چاہتا ہے، جو وہ کر رہا ہے اور زیادہ سے زیادہ کرتا رہے گا۔ اس طرح اس کے دل میں قدرت کے لیے محبت کا وہی جذبہ ہے جیساکہ ایک عورت کے لیے ایک مرد کے دل میں ہوتا ہے۔ اس قدرت کے سلسلے میں انسان کو مرد کہہ کر ممتاز حیثیت دیدی جاتی ہے۔

راجہ نل: (مسکراتے ہوئے) اچھا تو تمہاری راجکماری وہ کچھ ہے جو مرد قدرت کو بنانا چاہتا ہے۔

کلپنا: ہاں مہاراج۔ راجکماری دمینتی جتنی خوبصورت ہے آپ اُسے اس سے زیادہ خوبصورت بنانے کا تصوّر بھی نہیں کر سکتے۔

راجہ نل: ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہماری سکھی کلپنا دمینتی کی داسی بن چکی ہے۔

کلپنا: مہاراج — کلپنا تو راجکماری کی داسی بن کر بھی آپ ہی کی داسی ہے۔

راجہ نل: لیکن کلپنا — تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو کہ راجکماری دمینتی ہم سے وابستہ ہو کر زیادہ خوبصورت نہیں بن سکے گی ؟

کلپنا: وہ اور بات ہے مہاراج۔

راجہ نل: اور بات کیسے ؟

کلپنا: اس بات میں آپ کی خوبصورتی اس کی خوبصورتی میں شامل ہو جائے گی۔

راجہ نل: لیکن وہ حالت تو زیادہ خوبصورت ہوگی۔

کلپنا: اس میں کچھ تبدیلی نہیں آ جائے گی ؟

راجہ نل: وہ کیسے ؟

کلپنا: بیاہتا عورت کیا کنواری عورت سے مختلف نہیں ہوتی ؟

راجہ نل: کنوارا پن ادھورا پن ہے اور نسوانیت کا کوئی مختلف پہلو نہیں۔

کلپنا: ٹھیک ہے مہاراج — مگر اس سے راجکماری کی موجودہ خوبصورتی پر کوئی حرف نہیں آتا۔

راجہ نل: ہرگز نہیں — اور پیغام کیا ہے ؟

کلپنا: مزید پیغام یہ ہے کہ راجکماری دمینتی سوئمبر سے پہلے چوری چھپے آپ سے ملاقات کرنا چاہتی

ہیں۔

راجہ نل : واہ یہ کیسے ہوسکتا ہے ؟ راج گھرانے کی عزت اور روایت کو بالائے طاق رکھ کر اس کی دوشیزگی کیا اسے اس بات کی اجازت دیتی ہے ؟

کلپنا : عورت صرف قدرت نہیں ــــ (مسکراتے ہوئے) وہ لاجونتی کا پھول بھی نہیں جو چھوتے ہی مرجھا جاتا ہے۔

راجہ نل : کس کے چھونے سے ــ ؟

کلپنا : آپ کی آنکھوں کے لمس سے مہاراج ــ اس سے زیادہ کوئی لمس ابھی تک راجکاری کے تصور میں نہیں آیا ــــ

راجہ نل : اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ راجکاری مجھے اپنا حسن اتنا نہیں دکھانا چاہتی جتنا وہ مجھے دیکھنا چاہتی ہے۔ کیا تم نے اسے میری تصویر بنا کر نہیں دی ــــ

کلپنا : دی ہے مہاراج ــ وہ بھی اس تصویر کو دیکھ کر دل وجان سے فدا ہو گئی تھیں۔

راجہ نل : تو پھر وہ مجھے رُوبرو کیوں دیکھنا چاہتی ہے ــ ؟

کلپنا : مہاراج کی خوشی میں میری خوشی ہے ــــ

راجہ نل : کلپنا ــ یہ نامناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک دوشیزہ خواہ وہ راجکاری دمینتی کیوں نہ ہو اپنے آپ کو مجھ جیسے راجہ کے سپرد کرنے سے پہلے رُوبرو دیکھنے کی خواہش مند ہو ــــ اسے تو پہلے ہی میری شہرت سے عقیدت ہو جانی چاہیے تھی۔ اور اگر کوئی کمی رہ گئی تھی وہ تمہارے یقین دلانے پر پوری ہو جانی چاہیے تھی۔ تم نے تو اس سے بھی آگے قدم اُٹھایا ہے ــــ میری تصویر بنا کر اُسے دے چکی ہو۔ اگر وہ اب بھی مطمئن نہیں تو کیا یہ میری مردانگی اور میرے جاہ وجلال کی توہین نہیں ؟

(بناوٹی غصّے سے چہرے کو سُرخ کر لیتا ہے)

کلپنا : (ڈرتے ہوئے) مہاراج ــ ناراض نہ ہوں ــ میں راجکاری کو روک دوں گی۔ مہاراج جانتے ہیں کہ خود کو آپ کے حوالے کرنے میں راجکاری ذرا بھی ہچکچا نہیں رہی ہیں۔ سوئمبر کا رچایا جانا تو شاہی روایت کا تقاضا ہے۔

راجہ نل : نہیں۔ راجکاری کو روکنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ راجکاری بے جھجک مجھے دیکھ سکتی ہے۔ میں خفیہ ملاقات کے لیے تیار ہوں ــــ

کلپنا : لیکن مہاراج شاید راجکاری کا مقصد یہ ہو کہ وہ اس ملاقات میں مہاراج کو اپنا اصل روپ دکھا کر آپ کی پکی اور اٹوٹ منظوری حاصل کرنا چاہتی ہو ــــ

راجہ نل : کیا اس کا مطلب یہ لیا جائے کہ وہ یہ فیصلہ کرنا چاہتی ہے کہ مجھے وہ یقینی طور پر قبول ہے۔ کیا وہ اس طریقہ سے یہ چاہتی ہے کہ جب میں مستقبل میں اس سے اوب جاؤں تو دوسری شادی نہ کر سکوں ؟

کلپنا : میں کوئی جواب نہیں دے سکتی۔ ڈرتی ہوں کہ میرا کوئی جواب مہاراج کو اور بھی ناراض نہ کر دے ــــ بہرحال آپ کی جو بھی مرضی ہے، وہ راجکاری کو منظور ہے۔

(اچانک کڑکتی ہوئی آواز سنائی دیتی ہے جیسے چھت پر بجلی گری ہو ــــ بھیانک چمک۔ کلپنا خوف زدہ ہو کر دوڑتی ہوئی باہر چلی جاتی ہے ــــ اس کمرے کے دروازے کھٹکھٹاتے ہوئے بند ہو جاتے ہیں۔ چھت میں سے ایک پُر جلال شخص اترتا ہے جس کے آگے راجہ نل جھک کر کورنش بجالاتا ہے۔ وہ راجہ نل کو بازو سے پکڑ کر سیدھا کھڑا کر دیتا ہے۔ دونوں کھڑے ہوتے ہیں کہ باہر سے کوئی دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔ دروازہ کھٹکھٹانے والا راجہ نل کا وزیر ہے جو کلپنا کی آمد پر ساتھ کے کمرے میں چلا گیا تھا۔)

منتری : (دروازے کو پردے کے پیچھے سے کھٹکھٹاتے ہوئے) مہاراج۔ مہاراج۔ خیریت تو ہے؟ آپ ٹھیک ٹھاک ہیں۔

(دروازے کو پیچھے سے دھکہ دیتا ہے لیکن دروازہ کھلتا نہیں)

راجہ نل : میں ٹھیک ہوں۔ تشویش کی ضرورت نہیں۔ آپ وہیں بیٹھے ہوئے میرے حکم کا انتظار کیجیے۔ میں دیوتا کے سامنے ہوں۔

(دوسرے دروازے پر دستک ہوتی ہے۔ یہ کلپنا ہے۔)

کلپنا : (پردے کے پیچھے سے دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے) مہاراج۔ معاف کیجیے گا۔ میں بجلی کی کڑک سن کر دوڑ گئی۔ آپ خیریت سے تو ہیں ؟ دروازہ کھلے تو آپ کی خدمت میں حاضر ہوں۔

راجہ نل: گھبراؤ نہیں۔ میں خیریت سے ہوں۔ دیوتا کے روبرو ہوں۔ تم جہاں کہیں ہو۔ وہاں میرے حکم کا انتظار کرو۔ (اندر دیوتا کی طرف مڑتے ہوئے) کیا حکم ہے دیو! زہے قسمت کہ آپ کے دیدار نصیب ہوئے۔

(یہ دیوتا جو کڑکتے ہوئے چھت میں سے اترا ہے۔ اندر دیوتا ہے۔ بجلی اور بارش کا دیوتا)

اندر: راجہ نل ـــــ میں اندر دیوتا ہوں۔

راجہ نل: نمسکار دیو ـــــ میں خوش نصیب ہوں کہ دیوتا نے اپنی دنیا چھوڑ کر دھرتی پر آنے کی زحمت گوارا کی۔ آئیے سنگھاسن پر براجیے۔

اندر: نہیں۔ مجھے تھوڑی دیر کے لیے بات کرنی ہے۔

راجہ نل: جیسے آپ کی مرضی۔ فرمائیے۔ کیا حکم ہے۔ سوم رس پیش کروں ـــــ

(پاس پڑی ہوئی چوکی پر سے سوم رس کا کٹورا بھر کے اندر دیوتا کو پیش کرتا ہے۔ اندر دیوتا کٹورا لے کر چوکی پر رکھ دیتا ہے۔)

اندر: نہیں۔ کوئی ضرورت نہیں۔

راجہ نل: ہم دیوتا کی ضروریات پوری کرنے والے کون ہوتے ہیں۔ آپ کٹورا ہونٹوں سے لگا لیتے تو یہ ہمارے لیے باعثِ فخر ہوتا۔

اندر: اچھا تو جاتے ہوئے تھوڑا سا پی لوں گا۔

راجہ نل: اس سے ہماری عزّت افزائی ہوگی۔ کہیے۔ کیا حکم ہے ـــــ؟

اندر: راجہ نل ـــــ مجھے پتہ چلا ہے کہ دمینتی کا سوئمبر رچایا جائے گا اور دمینتی جے مالا تمہارے ہی گلے میں ڈالے گی۔

راجہ نل: دیوتاؤں کی معلومات صحیح ہوتی ہیں۔ یہ میری خوش نصیبی ہے۔ میں دیوتا سے اس انتخاب کے لیے نیک خواہشات اور آشیرواد طلب کروں گا۔

اندر: میں اس انتخاب پر آشیرواد دینے نہیں آیا ہوں۔

راجہ نل: (فرطِ خوف سے) کیا ـــــ دیوتا! آپ کا کیا حکم ہے؟

اندر: تم اس سوئمبر میں نہیں جاؤ گے ـــــ

راجہ نل: (بے چین ہو کر) میرے نہ جانے سے راجہ بھیم سین کی توہین ہوگی۔ دیوتا۔ آپ مجھے سوئمبر میں

شامل ہونے سے کیوں روک رہے ہیں ؟

اندر : اس لیے کہ تم دمینتی کے قابل نہیں ہو ——

راجہ نل : (جھلا کر) تو پھر بھارت ورش میں کون سا مرد اس کے قابل ہے ؟

اندر : دمینتی کسی بھی مرد کے قابل نہیں۔

راجہ نل : میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔

اندر : میرا مطلب ہے کہ دمینتی میرے قابل ہے۔

راجہ نل : (حیرت سے) کیا۔ دیوتا۔ دمینتی آپ کے قابل ہے ؟

اندر : میری بات واضح ہے۔

راجہ نل : مگر دیوتا —— کیا دیولوک میں آپ کے لیے عورتوں کی کمی ہے۔ جو آپ نے اس دھرتی پر نظر ڈالی ہے۔

اندر : دیولوک بھی ہمارا —— یہ دھرتی بھی ہماری۔

راجہ نل : لیکن اے دیوتا۔ اس دھرتی کے سکھ تو آپ نے ہم انسانوں کے لیے چھوڑ رکھے تھے

اندر : اس کا دار و مدار ہماری خواہش پر ہے۔ ہم جب چاہیں انسانوں کو دیے ہوئے سکھ واپس لے سکتے ہیں۔

راجہ نل : (بیقرار ہو کر) اے دیوتا —— میں یہ کیا سن رہا ہوں۔ میں دمینتی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکوں گا —— اگر اے دیوتا آپ کو دمینتی اپنے لیے وقف کر لینی تھی تو اُسے دھرتی پر بھیجنا ہی نہیں تھا۔ اے دیوتا۔ رحم کیجیے ——

اندر : (ہنستے ہوئے) کس پر رحم کروں —— ؟ تم پر یا دوسرے دیوتاؤں پر ؟

راجہ نل : دوسرے دیوتاؤں کا کیا واسطہ —— ؟

اندر : دمینتی کے لیے ارمان میرے دل میں ہی نہیں پون دیو، جل دیو اور اگنی دیو بھی اس کے لیے تڑپ رہے ہیں ——

راجہ نل : پون —— اگنی —— جل۔

اندر : ہاں —— اور ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم چاروں دیوتا اس کے سوئمبر میں شامل ہوں گے۔ دمینتی جسے چاہے پسند کر لے —— دنیا کو اعتراض نہیں ہو گا۔ اور میں تمہیں دمینتی کے ناقابل سمجھتا ہوں اس لیے تمہیں دمینتی کے سوئمبر میں شامل ہونے سے روک رہا ہوں۔

راجہ نل : اے دیوتا ـــــ اگر میں دمینتی کے قابل نہیں ہوں تو وہ مجھے نہ چُنے۔
اندر : دمینتی کو اتنی سمجھ نہیں ـــ وہ قدرت ہے ـــ ناسمجھ ہے۔
راجہ نل: لیکن اے دیوتا آپ اس میں سمجھ بوجھ پیدا کر سکتے ہیں۔
اندر : ہم جانتے ہیں کہ ہم کیا کر سکتے ہیں۔ تمہارا اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ یہ تمہارا مسئلہ نہیں۔
راجہ نل: میرا مسئلہ کیا نہیں ؟
اندر : یہی کہ دیوتا کیا کر سکتے ہیں اور کیا نہیں۔
راجہ نل : (غصّے میں) نہیں۔ یہ میرا مسئلہ ہے۔ (بلند آواز میں) میں جان گیا ہوں کہ دیوتا کیا کر سکتے ہیں اور کیا نہیں کر سکتے۔ دیوتا۔ قدرت میں تصوّر بیدار نہیں کر سکتے۔
اندر : تمہارے یہ الفاظ دیوتاؤں کی توہین کر رہے ہیں۔
راجہ نل: (اپنی رَو میں) میں جان گیا ہوں کہ دیوتا کیا نہیں کر سکتے ـــ دیوتا قدرت میں شعور نہیں بیدار کر سکتے۔ دیوتا قدرت سے اپنی من چاہی نہیں کرا سکتے۔
اندر : خاموش ـــ ورنہ دیوتا کے شراپ کا شکار ہو جاؤ گے۔
راجہ نل: مجھ پہ دیوتا کا شراپ نازل ہو چکا ہے ـــ دیوتا ـــ آپ مجھے دمینتی کو اپنانے سے روک چکے ہیں لیکن اگر دیوتا قدرت سے اپنی من مانی نہیں کرا سکتے تو انسان بھی ان کی حکم عدولی کر سکتا ہے۔
اندر : اگر تم نے کچھ اور کہا تو شراپ دیدوں گا۔
راجہ نل: (بلند آواز سے) میں شراپ سے نہیں ڈرتا ـــ کیونکہ میں جان گیا ہوں کہ دیوتا قدرت کے آگے مجبور ہیں۔ جبھی ہم انسان استھار گرکر پرارتھنا کر کے تھک جاتے ہیں مگر ہماری آرزوئیں پوری نہیں ہوتی ہیں۔ ہم دیوتاؤں سے خوشحالی مانگتے ہیں تو قحط پڑ جاتا ہے ـــ ہم بارش مانگتے ہیں تو سوکھا پڑ جاتا ہے۔ بیٹا مانگتے ہیں تو گھر میں بیٹی آجاتی ہے۔ بیٹی مانگتے ہیں تو کچھ بھی نہیں ملتا ـــ میں سمجھ چکا ہوں ـــ دیوتا قدرت سے اپنی خواہش پوری نہیں کرا سکتے ـــ یہی وجہ ہے کہ ہم انسانوں کی مرادیں کبھی پوری نہیں ہوتیں۔
اندر : (فولاد کی کڑک اور چمک کے ساتھ) راجہ نل ـــ ہوش کے ناخن لو ـــ دیوتا کے حکم کو ٹھکرانے کی جرأت نہ کرو۔

راجہ نل: (ڈرتے ہوئے) ہاں۔ اے دیوتا ــــ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ میں آپ کے مقابلے میں کمزور ہوں ــــ آپ میری التجائیں پوری کروا سکیں یا نہ کرا سکیں اس کے باوجود میں آپ کے سامنے حقیر ہوں ــــ میں آپ کے شراپ سے ڈرتا ہوں۔ میں آپ کی گھن گرج سے ڈرتا ہوں۔ میں آپ کی چمک سے ڈرتا ہوں ــــ میں بجلی سے ڈرتا ہوں آپ کا حکم ماننے کے سوا میرے لیے کوئی اور چارہ نہیں۔

اندر : تو پھر میرا حکم مانو ــــ

راجہ نل : (اُسی رَو میں) میں آگ سے ڈرتا ہوں جو جنگلوں کو خاکستر کر دیتی ہے۔ کھیتوں کو راکھ بنا دیتی ہے۔ انسان کے بنائے ہوئے گھروں کو جلا دیتی ہے۔

اندر : ہاں ــ اسی اگنی کا دیوتا یہ چاہتا ہے کہ تم دمینتی کے سوئمبر میں شرکت نہ کرو۔

راجہ نل : (سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے) میں جھکڑ سے ڈرتا ہوں ــ آندھی سے ڈرتا ہوں ــــ یہ میری سلطنت کے جنگلوں میں پیڑ اکھاڑ ڈالتی ہے۔ میری سلطنت میں پھلوں کو پکنے سے پہلے گرا دیتی ہے میرے کسانوں کے کھیتوں میں فصل کے شگوفے جھاڑ کر ان میں دانے نہیں پڑنے دیتی۔

اندر : ہاں ــــ اُسی جھکڑ کا دیوتا پون تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم دمینتی کے سوئمبر میں شامل نہیں ہو گے ــــ

راجہ نل: (سی لہجے میں) میں سیلاب سے ڈرتا ہوں ــ میں پانی کے نہ رکنے والے بہاؤ سے ڈرتا ہوں ــ وہ میرے کسانوں کی کھیتیاں بہا لے جاتا ہے۔ میری رعایا کے گھروں اور بستیوں کو ڈبو کر برباد کر دیتا ہے ــ میری رعایا کے ہنستے کھیلتے بیٹوں بیٹیوں کو ڈبو کر اور دم گھونٹ کر مار ڈالتا ہے۔

اندر : ہاں ــ اسی سیلاب کا جل دیوتا تمہیں دمینتی کے سوئمبر میں جانے سے روک رہا ہے۔

راجہ نل: میں دیوتاؤں سے ڈرتا ہوں ــ اگر دیوتاؤں کا یہی حکم ہے کہ میں دمینتی کے سوئمبر میں نہ جاؤں تو ایسا ہی ہوگا۔ مگر اس پر بھی دمینتی نے کسی دیوتا کو چننے سے انکار کر دیا تو...... اگر دمینتی قدرت ہے تو وہ دیوتا کی تمنّا پوری کرنے سے انکار کر سکتی ہے۔

اندر : (کچھ سوچ کر) تمہاری یہ بات تو ٹھیک ہے۔ (کچھ اور سوچ کر) راجہ نل! تم پر یہ پابندی نہیں ہے کہ تم دمینتی کے سوئمبر میں نہ جاؤ۔

راجہ نل: (اور پریشان ہوکر) تو پھر اے دیوتا — میں کیا کروں؟ جانے کی اجازت بھی نہیں اور نہ جانے کی اجازت بھی نہیں۔

اندر : تم سوئمبر میں جانا اور ضرور جانا — ہم یہ نہیں چاہتے کہ راجہ بھیم سین کی توہین ہو۔ مگر کیا یہ سچ ہے کہ سوئمبر سے پہلے تم دمینتی سے خفیہ ملاقات کرنے جا رہے ہو —؟

راجہ نل: آپ کا جو حکم ہوگا وہی ہوگا۔

اندر : اس ملاقات میں دمینتی کو تم ایسے روپ میں ملو کہ وہ تمہیں پسند نہ کرے —

راجہ نل: اے دیوتا — یہ تو کڑی پابندی ہے۔ میں اپنا روپ کیسے بدلوں کہ وہ مجھے واقعی پسند نہ کرے۔

اندر : اچھا یوں نہ سہی — ہم تمہیں کسی طرح نیچا دکھا کر خوش نہیں ہیں — ملاقات کے دوران تم اس سے کہہ دینا کہ وہ تمہیں پسند نہیں — اور یہ بھی کہہ دینا تھا کہ جیسا سنا تھا وہ ویسی نہیں ہے —

راجہ نل: اے دیوتا — آپ تو دانشمند ہیں — پریم کی ڈور میں بندھے ہوئے انسان ایسے نہیں ہوا کرتے —

اندر : اچھا — اگر بات اس طرح بھی نہیں بنتی تو تم اس سے کہنا کہ تم ایک خوفناک شراپ کے زیر اثر ہو۔ اور وہ شراپ اسی صورت میں ختم ہو سکتا ہے کہ گھور تپسیا سے دیوتاؤں کو خوش کیا جائے اور دیوتاؤں کو رجھانے کے لیے زبردست تپسیا اور تیاگ یہی ہے کہ سوئمبر میں دمینتی تمہیں چھوڑ کر کسی دیوتا کو پسند کرے — تم اس سے کہنا کہ اگر وہ تم سے پیار کرتی ہے اور تمہاری خیر سگالی چاہتی ہے تو وہ تمہیں شراپ سے نجات دلانے کے لیے کسی دیوتا کے گلے میں جے مالا ڈالے —

راجہ نل: اے دیوتا — رحم کیجیے — مجھ سے اور دمینتی سے اتنی گھور تپسیا نہ کرائیے۔ اگر آپ کو دمینتی سے محبت ہے تو اسے حاصل کرنے کے لیے کوئی اور جتن کیجیے۔

اندر : (دھمکی دیتے ہوئے) تو پھر تم صاف انکار کر رہے ہو؟

راجہ نل: میں آپ کی حکم عدولی کیسے کر سکتا ہوں — لیکن میں دمینتی کو فریب بھی نہیں دے سکتا۔

اندر : تم اسے دمینتی سے فریب سمجھتے ہو —؟

راجہ نل: ہاں — میں اسے دمینتی سے فریب سمجھوں گا۔

اندر : تم یہ سمجھے بیٹھے ہو کہ دمینتی تمہاری ہو چکی ہے۔ تم دیوتا کی طاقت کو حقیر سمجھ رہے ہو۔ تم یہ نہیں جانتے کہ دیوتا دمینتی کا دل تمہاری طرف سے پھیر سکتا ہے۔

راجہ نل: پھر تو اے دیوتا پہلے طریقہ سے یہ طریقہ آپ کے لیے زیادہ اچھا ہوگا۔ مجھے یہ بات منظور ہے۔ آپ ہی اس کا دل میری طرف سے پھیر دیجیے۔

اندر : تم اس طرح دیوتا کو للکار رہے ہو — اچھا تمہیں گستاخی کا پھل ملے گا۔ میں تم سے سخت ناراض ہو کر جا رہا ہوں۔

(بجلی کی کڑک اور چمک میں اندر دیوتا روپوش ہو جاتا ہے۔ راجہ نل منہ کے بل گر پڑتا ہے اور کچھ دیر تک یوں ہی پڑا رہتا ہے۔ دونوں طرف کے دروازے ایک دم کھل جاتے ہیں۔ مختلف دروازوں سے کلپنا اور منتری آتے ہیں اور راجہ نل کو اٹھا کر بٹھا دیتے ہیں۔

منتری: مہاراج — ایسی بجلی۔ ایسی چمک اور کڑک زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔

کلپنا : مہاراج — میرا سانس اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ جب تک دروازے بند رہے بجلی کی کڑک سنائی دیتی رہی۔ میں قربان جاؤں آپ کی طبیعت تو اچھی ہے؟

راجہ نل: تشویش کی ضرورت نہیں۔ میں ہر طرح سے ٹھیک ہوں — دیوتا سے جھڑپ ہو گئی تھی۔

کلپنا اور منتری : (ایک ساتھ) دیوتا سے جھڑپ؟ بھگوان خیر کرے — اندر دیوتا کے غصّے سے بھگوان آپ کو محفوظ رکھے۔

راجہ نل: کلپنا — اور منتری جی — رعایا اور راجہ کے درمیان بھگوان راجہ کے حق میں ہوتا ہے۔ راجہ اور دیوتا کے درمیان بھگوان دیوتا کے حق میں رہتا ہے۔ بھگوان کمزور کا نہیں طاقتور کا ہے۔

منتری: آپ نہ کہیے مہاراج — بھگوان جو کرتا ہے اچھا ہی کرتا ہے — بھگوان سے ناراضگی بے سود ہے۔ اس کے حضور تو دعا ہی کی جا سکتی ہے۔

راجہ نل: منتری — کلپنا — عشق میں جکڑا ہوا اور شراپ کا شکار انسان ناراضگی اور دعا کی

حدوں سے دُور ہوتا ہے۔ اچھا دیکھتے ہیں دیوتا اور بھگوان کو کیا منظور ہے۔

منتری : مہاراج ــ آج جیسا مینہ، جھکڑ، بجلی اور اولے ــ زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ اگر نگر سے باہر دیہات پر بھی اندر دیوتا کا ایسا ہی قہر نازل ہوا ہے تو رعایا کا بھگوان ہی نگہبان ہے۔

کلپنا : مہاراج ــ اندر دیوتا کو رجھانے کے جتن کرنا چاہئیں۔

راجہ نل: تم جو کچھ بھی کر سکتی ہو کر لو ــ یہ ساری بات میری عقل اور طاقت سے باہر ہے۔

منتری : کنور پشکر دیو کو بلاتے ہیں۔ اس وقت ان کی صلاح لینا بہتر ہوگا۔

راجہ نل : ہاں پُشکر کو بھی بلا لو ــ کہیں چوپڑ کھیل رہا ہوگا۔

کلپنا : مہاراج۔ پشکر دیو کی عقل بے نظیر ہے، وہ ضرور دیوتا کے قہر سے بچنے کی کوئی ترکیب بتائیں گے۔

(پشکر دیو خود ہی بائیں دروازے سے اندر آجاتے ہیں ــ یہ راجہ نل کا چھوٹا بھائی ہے۔)

پشکر : مہاراج سلطنت میں کوئی عذاب ٹوٹ پڑا ہے۔ ورنہ ایسی برسات، جھکڑ، بجلی کیا کبھی کسی نے دیکھی تھی۔ بزرگوں سے بھی کبھی اس قسم کا واقعہ نہیں سنا۔ یوں لگا جیسے راج بھون پر بجلی گری ہو ــ پہلی کڑک سنتے ہی دوڑتا ہوا آیا ہوں ــ (لمبی سانس لیتا ہے جیسے ابھی دم میں دم نہ آیا ہو) دیکھتا کیا ہوں کہ سارے کواڑ بند ہیں۔ دروازے کے باہر کھڑا رہا۔ آخری بار جب بجلی کڑکی اور دروازے کھلے تو اندر چلا آیا۔ (لمبی سانس لیتا ہے۔)

راجہ نل : اچھا۔ (ہنستے ہوئے) پشکر دیو اتنا پریشان ہوا ــ چوپڑ کی بازی بیچ میں چھوڑ کر آئے ہو گے ــ؟

پشکر : مہاراج ــ آپ تو مصیبت میں بھی ہنستے ہیں۔ آپ عظیم ہیں ــ ہماری تو جان نکلی جارہی ہے ــ اچھا یہ تو کہیے کہ راج بھون میں خیریت ہے ــ (منتری اور کلپنا کی طرف دیکھتا ہے۔)

راجہ نل: یہاں تو خیریت ہے ــ باقی محلوں کا کچھ پتہ نہیں۔

کلپنا : سارے راج بھون میں خیریت ہے مہاراج۔ نگر کا کیا حال ہے یہ تو (پشکر سے)

آپ ہی بتا سکتے ہیں۔

پشکر : نگر میں بھی خیریت ہی معلوم ہوتی ہے۔ اگر کہیں کوئی حادثہ ہوا ہوگا تو پتہ چل جائے گا ـــــ راج بھون میں خیریت چاہیے، نگر کا کیا ہے۔ راج سکھی ہو تو رعایا بھی سکھ کی آس لگا سکتی ہے۔

راجہ نل : بظاہر تو راج بھون میں خیریت ہے لیکن مجھے شراپ دے دیا گیا ہے۔ دیوتا مجھ پر سخت ناراض ہو کر گیا ہے۔

پشکر : کوئی فکر نہ کیجیے مہاراج۔ آپ کی سلامتی چاہیے۔ دیوتا کو رجھا لیں گے۔ راجوں سے دیوتا زیادہ دیر تک ناراض نہیں رہتے۔ راجوں کے پاس دیوتاؤں کو منانے کے بہت سے وسائل ہوتے ہیں۔

راجہ نل : دیوتا مجھ سے جو شے مانگ رہا ہے وہ میں دے نہیں سکتا۔

کلپنا : (آہستہ سے) مہاراج۔ اس وقت آپ اپنے دل کی بات کسی سے نہ کہیے۔ اس سمے آپ خاموشی سے اپنے دل پر قابو پانے کی کوشش کیجیے ـــــ (زور سے) مہاراج کے دل کو زبردست دھکّا لگا ہے ـــــ ایسا معلوم ہوتا ہے۔

پشکر : (جس کے دل میں اس بات سے ایک وسوسہ اُبھر آیا ہے) مہاراج! گھبراہٹ میں انسان ایسی بہت باتیں کہہ جاتا ہے جو دیوتا کی توہین کے مترادف ہوتی ہیں یا دیوتا کو پسند نہیں آتیں۔ آپ خاموشی سے اپنے دل کو قابو میں رکھیے۔ دیوتاؤں کو رجھانے کی بات ہم پر چھوڑ دیجیے۔ آپ کی نوازش سے اور آپ کے دیے ہوئے وسائل سے ہم دیوتا کو منا لیں گے۔

کلپنا : پشکر جی جو کچھ کہہ رہے ہیں بالکل ٹھیک ہے۔ آپ کنج میں جا کر آرام کیجیے۔

منتری : ہاں آپ آرام کیجیے ـــــ دیوتاؤں کو منانے کا کام ہم پر چھوڑ دیجیے۔

راجہ نل : (مسکراتے ہوئے) اچھا ـــــ ہم راجہ لوگ بہت سا کام دوسروں سے کروایا کرتے ہیں۔ یہ ہمارے شاہی رُتبہ کا اصول ہے۔ ہم آرام کرنے جا رہے ہیں بھگوان سب کی رکھشا کرے۔

پشکر، کلپنا اور منتری : پرنام مہاراج!

(تینوں چلے جاتے ہیں)

پردہ

تیسرا ایکٹ

راج بھون میں راجکماری دمینتی کا سنگار کا کمرہ ـــــ راجکماری نہا دھو کر چولی اور ساڑھی پہنے ہوئے بال سنوار رہی ہے۔ جھروکے میں سے ایک نوجوان جو اس دھرتی کا انسان معلوم نہیں ہوتا کمرے میں اترتا ہے۔ یہ اگنی دیوتا ہے ـــــ راجکماری اُسے دیکھ کر اتنی سہم جاتی ہے کہ وہ چیخ بھی نہیں پاتی۔ یا اس دیوتا نے ایسا اثر ڈالا ہے کہ وہ سہمی ہوئی چیخ بھی نہیں سکتی اس کا ہاتھ کنگھی کرتا ہوا اس کے بالوں ہی میں رُک گیا ہے۔

اگنی دیوتا: (دمینتی کے روبرو جا کر) ڈرو نہیں راجکماری ـــــ میں کوئی چور، ڈاکو یا ٹھگ نہیں ہوں۔

دمینتی : (جس کا خوف کچھ دور ہو گیا ہے اور غصہ بڑھ گیا ہے) چور اور ٹھگ نہیں ہو تو اس جھروکے میں سے میرے سنگار کے کمرے میں آنے کا مطلب ـــــ

اگنی : جھروکے میں سے اس لیے آیا ہوں کہ میں آسمان سے اترا ہوں ـــــ اور آپ کے اس کمرے میں اس وقت آیا ہوں جب آپ لباس تبدیل کر چکی ہیں۔ اور پھر آپ سے مجھے تنہائی میں ہی بات کرنی ہے۔

دمینتی : میں کسی مرد سے تنہائی میں بات نہیں کیا کرتی ـــــ

اگنی : آپ ناراض نہ ہوں ـــــ پہلی بات تو یہ ہے کہ میں اس دھرتی کا باسی نہیں ہوں ـــــ اور دوسرے آپ یہ سچ نہیں کہہ رہی ہیں کہ آپ تنہائی میں کسی مرد سے نہیں ملتیں۔

دمینتی : (زیادہ غصے میں) اچھا تو آپ میرے کہنے پر یقین نہیں کرتے ـ آپ مجھ پر یہ الزام لگا رہے ہیں کہ کوئی مرد مجھ سے تنہائی میں ملتا ہے۔

اگنی : میں الزام نہیں لگا رہا ہوں راجکماری ـــ میری مراد جس مرد سے ہے اُس سے آپ کسی بری نیت سے نہیں ملتی ہیں۔ اس سے آپ دراصل پاکیزہ محبت کرتی ہیں۔

دمینتی : میں آپ کا مطلب سمجھ گئی۔ میرا سچا پریم راجہ نل سے ہے لیکن ہم تنہائی میں نہیں ملے۔
اگنی : اچھا تو میں غلطی پر ہوں گا۔ معاف کیجیے۔ لیکن یہ تو سچ ہے ناکہ آپ راجہ نل سے محبت کرتی ہیں ؟
دمینتی : اس بات کو تسلیم کرنے میں مجھے کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہے۔
اگنی : تو پھر راجہ نل کے قاصد آپ سے ملتی ہوں گی ——؟
دمینتی : اُن کا قاصد کوئی مرد نہیں۔
اگنی : آپ مرد والی بات پکڑ کر بیٹھ گئی ہیں۔ میں آپ پر گناہ کا الزام نہیں لگا رہا تھا۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔
دمینتی : پھر آپ کا کیا مطلب تھا —؟
اگنی : میں آپ سے آپ کے فائدہ کی ایک بات کہنا چاہتا ہوں ——
دمینتی : وہ کیا ؟
اگنی : آپ نے مجھ سے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ میں کون ہوں ؟
دمینتی : آپ ہی بتا دیجیے کہ آپ کون ہیں۔
اگنی : میں اگنی دیوتا ہوں۔
دمینتی : میرے لیے مناسب تو یہ تھا کہ میں آپ کا دیوتا کی حیثیت سے خیر مقدم کرتی لیکن جس ڈھنگ سے آپ یہاں آئے ہیں اس سے مجھے آپ کی نیّت پر شک ہو رہا ہے۔
اگنی : میری نیّت تو ٹھیک ہے اور میں ایک بات کہنے آیا ہوں۔
دمینتی : وہ کیا ؟
اگنی : آپ راجہ نل سے بیاہ کا ارادہ ترک کر دیجیے۔
دمینتی : کیوں؟ محبّت کوئی ارادہ نہیں جسے ترک کیا جا سکے۔
اگنی : ہاں۔ محبّت بھی فکر و خیال کے تحت ہونی چاہیے۔
دمینتی : وہ ایسا کیا خیال ہے جس کے لیے میں راجہ نل کی محبت کر دوں ؟
اگنی : راجہ نل سے دیوتا ناراض ہیں۔
دمینتی : کیا راجہ نل سے بھی کوئی ناراض ہو سکتا ہے۔ دیوتا اس سے کیوں ناراض ہیں ؟
اگنی : اس نے اپنی رعایا سے تعلّقات میں دیوتاؤں کا خیال نہیں رکھا۔

دمینتی : انھوں نے رعایا سے بہت اچھے تعلقات قائم کیے۔ کھیتی کا لگان ایک تہائی سے ایک چوتھائی کر دیا۔
اگنی : مگر ایسا کر کے اس نے مندروں اور برہمنوں کے حصّے کو کم کر دیا۔ اس وجہ سے برہمن اس سے ناراض ہیں اور دیوتا برہمنوں کے حمایتی ہیں۔
دمینتی : مگر ان برہمنوں کو رعایا سے بیر کیوں ہے ——؟
اگنی : یہ برہمنوں کا نجی معاملہ ہے۔ میں تو اتنا ہی جانتا ہوں کہ برہمن راجہ نل سے ناراض ہیں۔ اور برہمنوں کے حمایتی ہونے کی وجہ سے دیوتا بھی راجہ نل سے ناراض ہیں ——
دمینتی : راجہ نل سے دیوتاؤں کے ناراض ہونے کی کوئی اور وجہ تو نہیں ؟
اگنی : ہے ——
دمینتی : وہ کیا ؟ (اُٹھ کر کھڑی ہو جاتی ہے) مجھے خیال ہی نہیں رہا کہ دیوتا کھڑے ہیں اور میں ان کے سامنے بیٹھی ہوں —— یہ تو اچھا نہیں ہوا۔
اگنی : آپ جیسی حسینہ سے دیوتا بلند نہیں۔
دمینتی : (شرماتے ہوئے) ہاں تو اور کیا وجہ ہے ؟
اگنی : دیوتا آپ پر فریفتہ ہیں ——
دمینتی : (بڑے سکون سے) اس دنیا کے انسانوں پر کیا دیوتا بھی فدا ہو جاتے ہیں ؟
اگنی : آپ اس دنیا کی انسان نہیں ہیں۔ آپ تو اندر سبھا میں سب سے اعلیٰ رُتبہ پانے کے قابل ہیں۔
دمینتی : تو آپ مجھے اندر سبھا کی کوئی اپسرا یا نرتکی بنانا چاہتے ہیں ؟
اگنی : میں کیا چاہتا ہوں لیکن میں آپ کو اندر سبھا کی اپسرا نہیں بنانا چاہتا۔
دمینتی : تو پھر آپ کیا چاہتے ہیں ؟
اگنی : میں تو صرف آپ سے محبت کرتا ہوں ——
دمینتی : لیکن مجھ سے آپ کی محبت تکمیل کو کیسے پہنچ سکتی ہے ؟
اگنی : میں آپ کی خاطر دیولوک چھوڑ کر اس دھرتی پر چلا آؤں گا۔ یہاں میں کسی راجہ کی حکومت چھین لوں گا اور آپ کو اپنی رانی بنا لوں گا۔
دمینتی : مجھے افسوس ہے کہ میرے یہاں سے آپ کو مایوس لوٹنا ہوگا۔

اگنی : دیکھو راجکماری۔ راجہ نل اس دھرتی کا انسان ہے۔ مجھ اگنی کے ساتھ اس کا کیا مقابلہ۔
دمینتی : میں بھی تو اس دھرتی کی ہی باشندہ ہوں ــــ
اگنی : میں آپ کو دیوی بنالوں گا ــــ خالص اگنی!
دمینتی : اے دیوتا ــــ میں اگنی نہیں بننا چاہتی۔ آپ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیجیے۔ وہ دیکھیے۔ راجہ نل کی قاصد آرہی ہے۔
اگنی : راجکماری ــــ آپ نے پہلے تو نہیں کی مگر اب آپ میری توہین کر رہی ہیں۔
دمینتی : میرا مطلب آپ کی توہین کرنا نہیں۔ لیکن میں آپ کی آرزو ہرگز پوری نہیں کرسکتی ــــ اچھا نمسکار ــــ (ہاتھ جوڑ کر اسے چلے جانے کا اشارہ کرتی ہے۔)
اگنی : (اوپر اٹھتا ہوا) اچھا راجکماری ــــ میں ناامید نہیں جارہا ہوں۔ آپ اس بارے میں اور سوچ رکھیے گا ــــ
دمینتی : میں نے سوچ رکھا ہے۔

(دیوتا جھروکے میں سے اڑ جاتا ہے ــــ قاصد اُروشی داخل ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اُسے اگنی دیوتا دکھائی نہیں دیا۔)

اروشی : راجکماری جی۔ نمسکار۔
دمینتی : آؤ اُروشی۔ تمہاری دنیا کا ایک فرد ابھی ابھی میرے یہاں سے گیا ہے۔
اروشی : وہ کون تھا میرے دیس کا ــــ میرے دیس میں تو صرف ایک ہی فرد راجہ نل آپ کے پاس آنے کی جرأت کرسکتا ہے۔
دمینتی : (ہنستے ہوئے) تمہارے اس دیس کا نہیں ــــ بلکہ اندرلوک کا جہاں تم ایک اپسرا ہو۔
اروشی : (اس اشارے کو نہ سمجھتے ہوئے) میں تو راجہ نل کے دربار کی اپسرا ہوں راجکماری، کسی اندرسبھا کی اپسرا نہیں۔
دمینتی : (بات کو ٹالتے ہوئے) اچھا تو تم کیا پیغام لائی ہو ــــ راجہ نل کے دربار سے ؟
اروشی : (کیسر سے رنگا ہوا ایک بند خط دیتی ہے) یہ ہے وہ پیغام۔
دمینتی : (جس کا چہرہ خط تھام کر حجاب اور خوشی سے سرخ ہو رہا ہے) اچھا اُروشی تم ساتھ کی بیٹھک میں ذرا سستالو ــــ میں تمہارے سامنے خط نہیں پڑھ سکوں گی۔
اُروشی : جو حکم راجکماری ــــ (چلی جاتی ہے)

دمینتی : (خط کھول کر ایک ہاتھ چھاتی پر رکھ لیتی ہے) اے دل ذرا دم لے۔ اس طرح کیوں دھڑک رہا ہے۔

(خط پڑھنے لگتی ہے کہ اوپر جھروکے میں سے ایک اور بہت ہی خوبرو شخص اترتا ہے ــــ یہ جل دیوتا ہے۔)

جل دیوتا: نمسکار راجکماری جی ــــ

دمینتی : (حیران ہوکر) ہیں۔ آپ کون ہیں ــــ؟ (اپنے پہلے تجربہ کی بنیاد پر سمجھتے ہوئے۔) آپ بھی کہیں دیولوک کے باسی تو نہیں ہیں ؟

جل دیوتا: ہاں راجکماری ــــ جب آپ جیسے انسانوں سے یہ دھرتی سجی ہوئی ہو تو مجھ جیسے دیولوک کے باسی بدنصیب ہیں۔

دمینتی : دیولوک اور اس کے رہنے والے بدنصیب ــــ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔؟ بھلا یہ ممکن ہو سکتا ہے ؟

جل دیوتا: ممکن تو نہیں ہونا چاہیے لیکن جس دن سے اس دنیا میں آپ کے حسن کا اُجالا ہوا ہم دیولوک کے رہنے والے خود کو بہت ہی بدنصیب سمجھ رہے ہیں۔

دمینتی : (ذرا خفا سی ہوکر) آپ بتائیے تو سہی کہ آپ کون ہیں ؟

جل دیوتا: میں جل دیوتا ہوں ــ میں آپ کے سامنے اپنے دل کا دکھ بیان کرنے آیا ہوں۔

دمینتی : آپ کو کیا دکھ ہے۔ آپ تو سب کا دکھ دور کرنے والے ہیں۔

جل دیوتا: مجھے تو راجکماری دمینتی کی بے مثال خوبصورتی نے مسحور کر رکھا ہے۔ اور میں دیولوک سے بھٹکتا ہوا اس دنیا کی طرف آیا ہوں ــــ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ اس دنیا کے راجہ پریکشت نے گھور تپسیا سے کچھ اس طرح دامن کھینچا تھا کہ دیوی گنگا کو شیو جی کی جٹاؤں کے راستے سے اس دنیا میں آنا پڑا تھا۔ آج آپ نے کچھ اس طرح دامن کھینچا کہ مجھے دیولوک چھوڑ کر آنا پڑا۔

دمینتی : راجہ پریکشت نے تو دیوی گنگا کو لوگوں کی بھلائی کے لیے اس دنیا میں آنے پر مجبور کیا تھا۔ میں تو ایسا کوئی جذبہ نہیں رکھتی۔ اور پھر اس دنیا میں آپ کے یوں اُتر آنے سے کسی کا کیا بھلا ہو سکتا ہے۔

جل دیوتا: راجکماری ــــ ایک پریمی کے پاس اتنے دلائل نہیں ہوتے۔ میں تو آپ سے یہ عرض کرنا چاہتا

ہوں کہ آپ میری محبت قبول فرمائیے۔

دمینتی : میں آپ کی محبّت کیسے قبول کرسکتی ہوں — میں نے تو راجہ نل کو بچن دے رکھا ہے۔

جل دیوتا: راجہ نل کو بچن دے رکھا ہے؟ اس جواری کو — راجکماری جی ہوش میں آئیے۔ وہ تو آپ کو بھی جوئے میں ہار جائے گا۔

دمینتی : تو پھر کیا ہوا — پہلے بھی ہمارے مرد ایسا ہی کرتے آئے ہیں۔

جل دیوتا: یدھشٹر نے درروپدی کو جوئے میں ہار کر کیا کسی کا کچھ سنوارا تھا۔

دمینتی : دیوتا — آپ نے خود ہی تو ابھی کہا تھا کہ پریمیوں کے پاس اتنے دلائل نہیں ہوتے — میں راجہ نل سے پریم کرتی ہوں —

جل دیوتا: راجکماری — آپ ایک دیوتا کے پریم کو ٹھکرا رہی ہیں۔ یاد رکھیے گا کہ دیوتا کا غصّہ اس کی محبت سے زیادہ طاقتور ہوتا ہے۔

دمینتی : (مضبوطی سے) جس طرح میں دیوتا کی محبّت سے بے نیاز ہوں اُسی طرح مجھے امید ہے کہ میں اس کے عتاب سے بھی بچی رہوں گی۔

جل دیوتا: آپ تو میرے عتاب سے بچی رہیں گی مگر راجہ نل نہیں بچ سکے گا۔

دمینتی : بھگوان ان کی بھی رکھشا کریں گے۔

جل : بھگوان ہم دیوتاؤں کے ساتھ ہے — وہ میرے خلاف اس دُنیا کے ایک انسان کی مدد کیسے کرسکتا ہے۔

دمینتی : یہ تو بھگوان ہی جانے — دیوتا۔ میری ایک سہیلی مجھ سے ملنے کے لیے آرہی ہے۔ اس کے آنے کا وقت ہو چکا ہے۔

جل دیوتا: میں جانتا ہوں۔ تمہاری سہیلی کون ہے —؟ وہ راجہ نل کی قاصد ہے — راجہ نل کا خط لیے ہوئے آپ کے پاس آئی ہوئی ہے اور ساتھ والی بیٹھک میں سستا رہی ہے۔ دیوتاؤں سے کچھ چھپایا نہیں جاسکتا۔

دمینتی : پھر دیوتاؤں کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ راجہ نل کے سوا دمینتی کسی اور سے محبت نہیں کرسکتی۔

جل دیوتا: اچھا راجکماری — اگر آپ اپنی ہٹ پر قائم رہیں گی تو یہ آپ کے لیے اچھا نہیں ہوگا —

دمینتی : میری ہٹ میرا پریم ہے ——
جل دیوتا : اچھا دیکھیے گا کہ اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔ ایک دیوتا کسی کے سامنے اپنے آپ کو اس سے زیادہ نہیں جھکا سکتا۔
دمینتی : اسی لیے میں دیوتا سے التجا کرتی ہوں کہ وہ اپنے بلند مقام کو واپس چلا جائے۔ نمسکار۔
جل دیوتا : (اڑ کر جھروکے کی طرف جاتے ہوئے) نمسکار —— اب بھی میں آپ کو سوچنے کی مہلت دے رہا ہوں —— (چلا جاتا ہے)
دمینتی : پریم ایک ہٹ ہے —— سوچ نہیں۔ (پھر اسی لہجے میں) اُروشی ——
اروشی : (دروازے میں آکر) جی راجکماری جی۔
دمینتی : میرے دل پر کچھ ایسی گزر رہی ہے کہ میں ٹھیک سے راجہ کے خط کا جواب نہیں دے سکتی —— تم کل کسی وقت آنا۔
اروشی : بہت اچھا راجکماری جی۔ نمسکار۔
(جھک کر نمسکار کرتی ہے اور چلی جاتی ہے)
دمینتی : اگنی دیوتا —— جل دیوتا —— دیکھیں —— اور کون کون سے دیوتا راجہ نل سے حسد کرتے ہیں یہ سب کچھ میری خاطر ہو رہا ہے —— کیا میں اتنی ہی خوبصورت اور لاجواب ہوں۔ میری داسی شاید ٹھیک ہی کہا کرتی ہے۔
(اپنے احساسِ حسن کے ناز سے جھومنے لگتی ہے۔ اور پیر سے آہستہ آہستہ دھرتی پر تال دیتی ہے۔)
دمینتی : میرا جی ناچنے کو چاہتا ہے —— راجہ نل کا خط کتنے خوبصورت جذبات سے بھرا ہوا ہے —— میں اس پریم پر سارے دیومنڈل کو قربان کر سکتی ہوں ——
(جھروکے میں سے ایک اور دیوتا اترتا ہے —— یہ پون دیوتا ہے۔)
پون : راجکماری جی۔ آپ تو ایک سرور میں ناچتی ہوئی معلوم ہو رہی ہیں۔ نمسکار ——
دمینتی : (اس بار حیران نہیں ہوتی) آپ بھی کوئی دیوتا نظر آرہے ہیں!
پون : (ذرا جھلا کر) میں بھی کوئی دیوتا نظر آرہا ہوں —— کیا اور بھی دیوتا آپ کے یہاں آتے ہیں؟
دمینتی : دیوتاؤں کے دیدار بس آج ہی نصیب ہوئے ہیں۔

پون : کس کس کے ؟
دمینتی : اگنی دیوتا اور جل دیوتا کے ـــــ
پون : میں پون دیوتا ہوں راجکماری ـــــ
دمینتی : پون دیوتا۔ (شوخی کے ساتھ) کہیں مجھے اڑا کر نہ لے جایئے گا۔
پون : آیا تو یہی ارادہ لے کر ہوں ـــــ
دمینتی : (سنگار کی چوکی کے پایے کو پکڑ کر بیٹھتے ہوئے) پھر تو میں ذرا سنبھل کر بیٹھ جاؤں۔
پون : (ہنستے ہوئے) دیوتا کسی کو جبراً اٹھا کر نہیں لے جاتے۔
دمینتی : میں تو مذاق کر رہی تھی دیوتا ـــ آیئے ـــ خوش آمدید! آپ کی کیا خدمت کی جائے
پون : اس بار دیوتا خدمت کرانے نہیں کرنے آیا ہے ـــــ
دمینتی : نہ دیوتا ـــ ایسے الفاظ کہہ کر مجھے گناہگار نہ بناؤ۔
پون : راجکماری جی ـــ مجھے یوں ہنسوں کی طرح نہ ٹالیے ـــــ
دمینتی : آپ کو کس بات کے لیے نہ ٹالا جائے ـــ ؟
پون : پریم کے لیے ـــــ
دمینتی : کیا ـــ آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں دیوتا ؟
پون : راجکماری ـــ میں آپ کے قدموں میں اپنے پریم کی بھینٹ دینے آیا ہوں ـــ
دمینتی : دیوتا ـــ میں اس دنیا کی ایک معمولی سی لڑکی ہوں۔ مجھے اس طرح نہ بنایئے ـــ
پون : راجکماری جی۔ میں آپ کو بنا رہا ہوں یا آپ مجھے ـــ ؟
دمینتی : وہ کیسے؟
پون : میں پریم کی بھینٹ دینے آیا ہوں اور آپ ٹالے جا رہی ہیں۔
دمینتی : دیوتا میں کسی کے پریم کی بھینٹ کے قابل نہیں ہوں ـــ
پون : کیوں؟
دمینتی : میں یہاں اس دنیا میں کسی سے پریم کرتی ہوں ـــ
پون : میں جانتا ہوں ـــ آپ راجہ نل کو اپنا دل دے بیٹھی ہیں۔ میں آپ کو اس ارادے سے باز رکھنے آیا ہوں۔
دمینتی : آپ مجھے محبت کرنے سے کیوں روک رہے ہیں ؟

پون : پہلی وجہ تو یہ ہے کہ میں خود آپ سے محبت کرتا ہوں ـــ دوسری یہ کہ راجہ نل سے دیوتا ناراض ہو گئے ہیں ۔

دمینتی : دیوتا راجہ نل سے کیوں ناراض ہو گئے ہیں ؟

پون : انھوں نے جو یگیہ رچایا تھا اس میں دیوتاؤں اور برہمنوں کی توہین کی تھی۔

دمینتی : وہ کیسے ؟

پون : معزّزین میں آپ کی مورتی کو جگہ دے کر ـــ

دمینتی : مرد کے لیے اس کی محبوبہ قابل پرستش ہوتی ہے ـــ بھگوان بھی تو لکشمی سے پرستش کی حد تک محبّت کرتے ہیں ـ اور شیو جی پاربتی سے ـــ

پون : لیکن انسانوں کو یہ زیب نہیں دیتا اور اس کی اجازت بھی نہیں ہے ـ یاد رہے ـــ رام جی کو سیتا جی کے ساتھ گھر سے نکل جانا پڑا تھا ـــ

دمینتی : وہ تو لوک لاج کے لیے تھا ـــ دیولاج کے لیے نہیں ۔

پون : تو کیا لوک لاج دیولاج سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے ؟

دمینتی : میرا یہ مطلب نہیں ۔ دیوتا کو ایسا وہم کیوں ہوا ـــ ؟

پون : دیوتا بھی حسد اور محبّت کرتے ہیں ـــ

دمینتی : دیوتا مجھ سے یا راجہ نل سے محبت اور حسد کیوں کریں ۔ ہم تو اس دنیا کے معمولی انسان ہیں ۔

پون : آپ معمولی نہیں ۔ آپ دیولوک پر حکومت کے قابل ہیں ۔

دمینتی : مگر مجھے اس حکومت کی خواہش نہیں ۔ میرے لیے تو راجہ نل کی محبت اور ان کی حکومت ہی کافی ہے ۔

پون : راجکماری ـ میری محبت یوں نہیں ٹھکرائی جا سکتی ـــ

دمینتی : میں کیا کر سکتی ہوں ـــ میں اپنی محبت راجہ نل کو سونپ چکی ہوں ـــ

پون : آپ اس فانی دنیا کے انسان کو دیوتا سے بلند مقام دے رہی ہیں ۔ اس کا انجام اچھا نہیں ہو گا ۔

دمینتی : پریم اور بھگتی شرا اور راجہ سے بے نیاز ہوتے ہیں ۔ میری ایک سہیلی ساتھ والے کمرے میں میرا انتظار کر رہی ہے ۔ میں آپ سے اجازت چاہتی ہوں ۔

پون : (غصے میں) مجھے معلوم ہے کہ وہ راجہ نل کی قاصد ہے۔ لیکن وہ جا چکی ہے ـــــ یہ آپ کے آئینے کے آگے راجہ نل کا خط پڑا ہے جو کیسر سے رنگا ہوا ہے۔ مگر دیوتا اس محبت کو پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچنے دیں گے ـــــ

دمینتی : جو بھگوان کو منظور ہوگا وہی ہوگا۔ میں اپنے آپ کو راجہ نل کے سپرد کر چکی ہوں۔

پون : اچھا تو آپ تریا ہٹ کر رہی ہیں۔ سوچ لیجیے۔ میں آپ کو مہلت دیتا ہوں۔ نمسکار ـــــ

(پہلے دیوتاؤں کی طرح اڑتا ہوا جھروکے میں سے نکل جاتا ہے)

دمینتی : (اپنے آپ سے) اس سنگار بھون میں مجھے دیوتا دم نہیں لینے دیں گے۔ میں کہیں جا کر اپنے نل کے پریم پتر کا جواب لکھوں؟ میرا خیال ہے کہ اس کام کے لیے رسوئی بہتر رہے گی وہیں ایک کونے میں بیٹھ کر میں خط لکھوں گی۔ باندیاں وہاں ہوں گی مگر ان سے کون سی بات چھپی ہوئی ہے ـــــ اور پھر چھپانے والی بات بھی کیا ہے۔ راجہ نل چاہتے ہیں کہ میں جلدی سے سوئمبر رچا دوں ـــــ میں انھیں لکھے دیتی ہوں کہ پتا جی کی اجازت سے اگلے مہینے کی پورنماشی کو سوئمبر رچا لوں گی ـــــ

(سنگار بھون سے چلی جاتی ہے)

پردہ

چوتھا ایکٹ

مہاراجہ بھیم کی راجدھانی ودربھ میں دمینتی کا سوئمبر — ایک بڑے ریشمی شامیانے کے نیچے اور ریشمی قناتوں کے درمیان بچھے ہوئے قالینوں اور غالیچوں پر مختلف پردیشوں کے راجکمار اپنے دوستوں اور ساتھیوں کے جھرمٹوں میں بیٹھے اور کھڑے ہیں، جیسے آسمان میں تارے۔ ان کے درمیان سکھیوں کے جھرمٹ میں میں چندرمکھی دمینتی گھوم رہی ہے۔ راجکمار اپنے مکٹوں اور پگڑیوں پر خاص نشانات سے اپنے ساتھیوں کے درمیان بآسانی پہچانے جاتے ہیں۔

ان ہی راجکماروں میں سے دمینتی نے آج اپنا دولھا چننا ہے — یہ بھی ممکن ہے کہ وہ کسی کو بھی نہ چنے — اُس حالت میں اُسے شاید اپنے پتا کی پسند کا دولھا قبول ہوگا یا کرنا پڑے گا۔ اس جشن میں برہمن، گندھرو اور جیوتشی وغیرہ بھی الگ الگ یا ٹولیوں میں گھومتے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ کہیں ہلکی موسیقی کی دھنیں اُٹھ رہی ہیں، کہیں چھتوں پر چوپڑ کی بازیاں بھی لگی ہوئی ہیں۔ دمینتی کے لیے ضروری نہیں کہ وہ ایک گھنٹے یا مقررہ وقت میں کسی کو چن لے۔ اس کام کے لیے اس کے پاس سارا دن پڑا ہے — جشن کا رنگ اور ٹھاٹھ یہ تقاضا کرتا ہے کہ قطعی چناؤ دن ڈھلے ہو۔

ایک منڈلی ہماری توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہے جس میں راجہ نل تین اور اشخاص کے ساتھ چوپڑ کھیل رہا ہے۔ وہ تین دیوتا ہیں۔ اگنی، جل اور پون جو پہلے بھی دمینتی سے تنہائی میں مل چکے ہیں۔ اس ملاقات میں دمینتی نے اگرچہ ان کو مایوس کن جواب دیا تھا لیکن اپنی طاقت پر بھروسہ کیے ہوئے وہ آج سوئمبر میں موجود ہیں اور انھوں نے راجہ نل کو اپنے ساتھ چوپڑ کھیلنے پر مجبور کر دیا ہے۔ جب دمینتی اور اس کی سکھیاں اس منڈلی کے قریب پہنچتی ہیں تو بازی ختم ہو چکی ہوتی ہے۔ دمینتی آ کر اس منڈلی کے قریب کھڑی ہو جاتی ہے۔ سب کی نظر

اس پر پڑتی ہے۔ سب سے پہلے جل دیوتا بول اٹھتا ہے۔

جل دیوتا: دیکھیے راجکماری جی۔ نشدھ نگر کے راجکمار جو اس دنیا میں چوپڑ کے بہترین کھلاڑی مانے جاتے ہیں ہم میں سے دو کے ہاتھوں ایک ایک بار ہار چکے ہیں اب تیسری بازی مجھ سے ہو گی۔ میں اپنے ساتھیوں میں چوپڑ کھیلنے میں ان سے کم عقل ہوں ــــ اگر آپ یہاں کھڑے کھڑے دیکھتی رہیں تو میرا حوصلہ اس قدر بڑھے گا کہ راجہ نل سے بازی جیت لینے کی شرط پیشگی لگانے کے لیے تیار ہوں۔

دمینتی : (مسکراتے ہوئے) کیا شرط لگائیں گے آپ ؟

جل دیوتا: (کچھ سوچ کر) جو ہار جائے وہ اپنی عزیز ترین چیز پر اپنا حق چھوڑ دے۔

دمینتی : (ناز و ادا سے) کیوں راجکمار جی۔ کیا آپ ایسی شرط لگانے کا ارادہ رکھتے ہیں ؟

راجہ نل: (کچھ سوچتے ہوئے) اس سوال کا جواب میرے لیے بہت دشوار ہے۔

اگنی : اس میں دشواری کیا ہے ؟

نل : پہلی دشواری تو یہ ہے کہ میں اپنی محبوب ترین چیز کو کسی کی جیت یا ہار کے تحت چھوڑنے کو تیار نہیں ہوں مگر دوسری طرف اس کا یہ مطلب نکلتا ہے کہ مجھ میں بازی لگانے اور جیتنے کی ہمت نہیں۔ یہ شرط لگانا میرے پریم کے لیے کٹھن ہے اور شرط نہ لگانے سے میرے وقار پر ضرب پڑتی ہے۔

دمینتی : ایک کشتری کے لیے پریم اور وقار کے درمیان امتیاز کرنا دشوار ضرور ہوتا ہے مگر ناممکن نہیں ہوتا۔

پون : آپ بجا فرما رہی ہیں راجکماری جی۔

اگنی دیوتا: اور وہ امتیاز یہی ہو سکتا ہے کہ پریم کو وقار کے سامنے دوسرا درجہ دیا جائے۔

دمینتی : پریم وقار کا ہی ایک روپ ہے۔

راجہ نل : دو یکساں صورتوں میں انتخاب بے معنی ہے۔ یہاں انتخاب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ایک سکھی: وقار پریم کا ایک روپ ہے ــــ!

جل دیوتا: لیکن وقار مکمل محبت نہیں اور محبت مکمل وقار نہیں۔

اگنی دیوتا: ان دونوں میں فرق ضرور ہے۔

پون : اس لیے ان دونوں میں امتیاز کرنا بے معنی نہیں بلکہ ضروری ہے۔

راجہ نل کا ساتھی : مسئلہ پھر بھی دشوار رہتا ہے۔
راجہ نل : ہم اس کا فیصلہ راجکماری دمینتی پر چھوڑ دیتے ہیں۔

(اس بات پر جل اور اس کے ساتھیوں کو ایک بار توزک پہنچتی ہے لیکن وہ جلدی سنبھل جاتے ہیں جیسے اس بات کا فیصلہ دمینتی سے کرانا ان کو منظور ہو۔)

دمینتی : (مسکراتے ہوئے) آپ اپنی دشواریوں کا بوجھ مجھ پر کیوں ڈال رہے ہیں۔
دمینتی کی سکھی : دیوتاؤں کا ہمیشہ یہی کردار رہا ہے۔
دمینتی : اور مردوں کا بھی۔
سکھی : اب دمینتی کو یہ فرض ادا ہی کرنا پڑے گا۔
دمینتی : (کچھ سوچ کر) راجکمار نل۔ ایک کشتری کے لیے وقار محبت سے اونچا درجہ رکھتا ہے۔
راجہ نل : (کسی اور بات کی ضرورت نہ سمجھتے ہوئے) اچھا۔ اگر راجکماری جی کا فیصلہ یہی ہے تو میں شرط لگا کر تیسری بازی کھیلنے کے لیے تیار ہوں۔

(سب تالیاں بجا کر اس فیصلہ کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ چوپڑ بچھائی جاتی ہے۔)

دمینتی : ذرا ٹھہریئے۔ ایک بات مجھے اور بتایئے۔ کیا پہلی دونوں بازیوں پر کوئی شرط لگائی گئی تھی ؟
راجہ نل : (بیقراری سے) نہیں ایسی کوئی شرط نہیں لگائی گئی تھی۔
اگنی دیوتا : لیکن راجکماری جی۔ ان دو بازیوں میں راجکمار نل بہت کچھ ہار چکا ہے۔
دمینتی : (پریشان ہو کر) راجکمار کیا کچھ ہار چکا ہے ؟
اگنی دیوتا : راجکمار اپنی فصل پون دیوتا کے پاس رہن رکھ چکا ہے۔ پون دیوتا کی مہربانی ہو گی تو یہ ساگر سے بادل لایا کریں گے اور ان کو برسا کر کھیتوں میں سینچائی کیا کریں گے۔ اگر پون دیوتا بادل نہیں لائے گا تو برکھا نہیں ہو گی اور راجکمار کے دیس میں کھیتی سوکھ جائے گی، اور قحط پڑ جایا کرے گا
دمینتی : پروا نہیں۔ پون کا دھرم ہے چلنا۔ ساگر میں سے بادل لانے کے فرض سے وہ کیسے کوتاہی کر سکتے ہیں۔

دمینتی کی سکھی : راجکمار اگنی دیو سے جو بازی ہارے ہیں اس میں کیا شرط لگی تھی ؟
پون : اس میں راجکمار نل اپنے دلیش کی ساری نباتات اگنی دیو کے آگے ہار چکا ہے۔
دمینتی : (زیرِ لب) بیچارا نل دیوتاؤں سے ٹکر لے رہا ہے۔
(سکھی کو ساتھ لیے ہوئے پرے چلی جاتی ہے)
سکھی : (جاتے ہوئے) آدمی دیوتاؤں سے ٹکر لے کر کیسے جیت سکتا ہے ؟
دمینتی : لیکن راجہ نل کو جیتنا ہوگا۔
(دمینتی سکھی کے کان میں کچھ کہتی ہے اور سکھی وہیں رُک جاتی ہے۔
دمینتی ذرا آگے بڑھ جاتی ہے۔
اب ہماری توجہ اسٹیج کے ایک اور حصّہ پر مرکوز ہو جاتی ہے۔
دمینتی کو جاتے ہوئے راجہ بھیم اور ان کی منڈلی ملتی ہے۔ راجہ بھیم کا ایک نوجوان ساتھی جو دمینتی کا شاید نزدیکی رشتے دار ہے بول اُٹھتا ہے۔)
سمیر : اے بہن۔ یہ رونق انتہا پر کب پہنچے گی ؟
دمینتی : (مسکراتے ہوئے) میں نے تو ابھی تک آدھے منڈپ کا بھی جائزہ نہیں لیا۔ کیوں اس ہنگامے سے کیا آپ اکتا چکے ہیں ؟
سمیر : ایسی رونق سے کون اکتاتا ہے —— لیکن دل جلدی اور بیتابی کا خوگر ہوتا ہے سُنا ہے کہ ہمالیہ پربت کے ولیعہد جل کی شان و شوکت نرالی ہے میں اس کی طرف جا رہا ہوں۔
دمینتی : جائیے۔ اور دیکھیے۔ (انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے) وہ چوپڑ کھیل رہا ہے۔ وندھیاچل کا راج دیوا گنی بھی وہیں ہے اور پورب کا پون بھی۔
ایک اور نوجوان : (اسے وہ باتیں بھی معلوم ہیں جو دوسروں سے ڈھکی چھپی ہیں) چوتھا کھلاڑی کون ہے ؟ راجکاری جی نے اس کا نام نہیں لیا۔
(دمینتی کا چہرہ شرم و حجاب سے تمتا اٹھتا ہے۔ وہ چپ رہتی ہے۔)
راجہ بھیم : ہاں۔ وہ چوتھا کھلاڑی کون ہے؟ وہ ان کی منڈلی کا ہے یا اجنبی !
نوجوان : وہ نشدھ کا راجکمار نل ہے۔ دیوتاؤں کی منڈلی میں اس کی شمولیت کی بات کبھی سنی

نہیں۔شاید آج شامل ہو جائے۔

دمینتی : (مجبور ہوکر) وہ بیچارہ ان دیوتاؤں کی منڈلی میں کیا شامل ہوگا۔چوپڑ کی دو بازیاں پون اور اگنی سے ہار چکا ہے۔

بھیم : کیا! دو بازیاں ہار چکا ہے۔پھر اس کے پاس رہا کیا ہوگا۔اب کس بنا پر اسے سوئمبر میں شمولیت کا حق دیا جا سکتا ہے ؟

دمینتی : (یہ سمجھتے ہوئے کہ اس نے یہ بات کہہ کر غلطی کی ہے ۔۔ وہ اس غلطی کو درست کرنے کی کوشش کرتی ہے) اب تیسری بازی وہ جل دیوتا سے کھیل رہے ہیں اور جیتتے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔

بھیم : ہاں ۔۔ تیسری بازی اگر جیت جائے تو پھر وہ فارغ البال ہو سکتا ہے۔

نوجوان: مجھے امید نہیں کہ وہ تیسری بازی جیت سکے گا۔جل دیوتا تو دوسروں سے بھی زیادہ شاطر اور گھاگ ہے۔وہ کہاں ہار سکتا ہے۔

دمینتی : میں اپنی سکھی کلپنا کو وہاں کھڑا کر آئی ہوں تاکہ اگر اس سے کوئی غلط چال چلوائی جا رہی ہو تو وہ اُسے خبردار کر دے۔

بھیم : (انجانے پن سے) بیٹی۔تمہیں اتنی پریشانی کی کیا ضرورت تھی ؟ جل دیوتا خواہ مخواہ ہمارا دشمن ہو جائے گا۔

نوجوان: جہاں محبت ہو وہاں دشمنی تو ادبدا کر پیدا ہو جاتی ہے۔ڈر کس بات کا ہے ؟ کیوں بہن۔ٹھیک ہے نا ؟

دمینتی : (شرماتے ہوئے) بھیّا۔تم بہت کچھ جانتے ہو۔

(کہنے کی کوئی اور بات ہی نہیں رہ گئی تھی اس لیے راجہ بھیم اور اس کے ساتھی آگے بڑھتے ہیں۔اس طرف جہاں دیوتا منڈلی چوپڑ کھیل رہی ہے۔دمینتی دوسری طرف چلی جاتی ہے۔
ناظرین کی توجہ کا مرکز اب وہی منڈلی بن جاتی ہے ۔۔۔ اب اس منڈلی کے نزدیک راجہ بھیم اور اس کے ساتھی جا کھڑے ہوئے ہیں۔)

جل دیوتا: (راجہ بھیم کو دیکھ کر اونچے اور جھلاّئے ہوئے لہجے میں) دیکھیے مہاراج۔یہ کتنا ہمارے

کھیل میں ناجائز رکاوٹ ڈال رہی ہے ۔

بھیم : (جو یہ سمجھتا ہے کہ کھیل میں رکاوٹ اس سکھی کے حسن کی وجہ سے پڑ رہی ہے) جل دیوتا۔ مردوں کے کھیل میں عورت کا حسن رکاوٹ ڈالنے کا حق رکھتا ہے۔

جل دیوتا: نہیں۔ اس کا حسن رکاوٹ نہیں ڈال رہا۔ اس کی عیاری رکاوٹ ڈال رہی ہے۔ کئی بار جب میں پانسہ پھینکتا ہوں تو یہ فرش کو ہلا دیتی ہے، اور میرا پانسہ پلٹ کر کچھ اور ہی ہو جاتا ہے۔

اگنی دیوتا: پھر بھی جل دیو ہی جیت رہے ہیں مہاراج ۔

بھیم : ہم نے تو یہ سنا تھا کہ یہ بازی راجکمار نل جیت رہے ہیں۔ اور آپ کہہ رہے ہیں کہ راجہ نل ہار رہا ہے۔ اگر یہ تیسری بازی بھی ہار گئے تو ان کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہے گا۔ جل دیو۔ اس راجکمار پر رحم کیجیے۔ ان کو یہ بازی جیت لینے دیجیے۔

جل دیوتا: (کچھ زیادہ جھلا اٹھتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ جیسے راجہ بھیم اور دمینتی کی ایک ہی صلاح ہو) پھر تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سکھی آپ کی اجازت سے کھیل میں رکاوٹ ڈال رہی ہے۔ مہانوں کو گھر بلا کر اُن سے ایسی دشمنی نہیں کرنی چاہیے مہاراج ۔

بھیم : (ڈرتے ہوئے) نہیں جل دیو۔ آپ تو میرے ویسے ہی مہان ہیں جیسے راجہ نل اور دوسرے راجکمار اور راجے ۔ (سکھی کو ڈانٹ پلانے کے لہجے میں) کلپنا۔ تم یہاں سے چلی جاؤ۔ تمہارے یہاں رہنے پر جل راج دیو کو اعتراض ہے ۔

(کلپنا وہاں سے حرکت کرتی ہوئی نظر نہیں آتی ۔)

جل دیوتا: دیکھ لیا مہاراج ۔ یہ یہاں سے جانا نہیں چاہتی۔

بھیم : (کڑکتی آواز میں) کلپنا۔ تم سُن نہیں رہی ہو۔ یہاں سے چلی جاؤ۔

(کلپنا تھوڑی سی حرکت کرتی ہے اور جاتے جاتے جل دیو کے پانسے کو "تین کانوں" میں پلٹ دیتی ہے ۔)

بھیم کا نوجوان ساتھی : (زیرلب) مہاراج ۔ ہو سکتا ہے کہ کلپنا راجکماری کی اجازت سے یہاں کھڑی ہو ۔

بھیم : (بلند آواز میں) نہیں۔ اسے یہاں کھڑی ہو کر کھیل میں رکاوٹ ڈالنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی ۔

(کلپنا یہ سُن کر چلی جاتی ہے۔
پانسہ بدل جاتا ہے جس سے جل دیو بازی میں پچھڑ کر غیظ آلود ہو جاتا ہے۔)

جل دیوتا: میرا پانسہ پلٹ کر میرا بہت نقصان کر گئی ہے۔ میں پانسہ پھر پھینکوں گا۔

راجہ نل: جل دیو۔ خواہ مخواہ کیوں بگڑ رہے ہو۔ (پانسہ پھینکتے ہوئے) ابھی یہ ہاتھ تو دیکھ لیجیے۔
(اتفاق سے اس بار راجہ نل کا پانسہ اونچا ہوتا ہے۔)

جل دیوتا: (غصّے میں) نہیں۔ میں یہ چال نہیں مانوں گا۔ میں اپنا ہاتھ نئے سرے سے پھینکوں گا۔

راجہ نل: (سخت ہو کر) میں اپنا یہ ہاتھ کھیلوں گا اور آپ کو اسے قبول کرنا ہوگا۔
(بھیم راج کچھ ڈرتا ہوا نظر آتا ہے لیکن دیوتا کچھ سوچ کر زیادہ غضب ناک نہیں ہوتے، پرسکون ہو جاتے ہیں۔)

اگنی دیوتا: پروا نہیں جل دیو ـــــ راجہ نل کو بازی دے دیجیے۔
(جل دیوتا خاموش رہتا ہے جیسے اس نے اگنی دیو کی بات مان لی ہو۔)

اگنی دیوتا: راجکمار جی۔ کیا ایک اور بھی چال آپ چلنا چاہتے ہیں۔ جل دیو سے اجازت بھی دلوا دیں گے۔

راجہ نل: (پُر وقار لہجے میں) میں دیوتا سے رعایت نہیں مانگتا۔ میں صرف اپنے حق کی علمبرداری کروں گا۔

اگنی: لیکن آپ دیوتا سے جیت نہیں سکتے، اسے صرف رجھا سکتے ہیں۔

بھیم: ہاں ـــ ہاں ـــ اگنی دیو ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ دیوتا کو جیتنے کی ہمّت کرنے کے بجائے اسے رجھانے کے ارادے میں کامیابی ملتی ہے۔

راجہ نل: مگر کیا آپ کو معلوم نہیں کہ یہاں دیوتا ارادے میں رخنہ اندازی پر تلا ہوا ہے۔ اس ارادے کو چھوڑ دینے پر یہ دیوتا خوش ہوگا۔

بھیم: پھر ایسا ارادہ چھوڑ دیجیے راجکمار جس پہ دیوتا ناراض ہو رہا ہے ـــــ

راجہ نل: یہ ارادہ مقدّس ہے ـــ اس میں دیوتا کو رکاوٹ ڈالنے کا کوئی حق نہیں۔

جل دیوتا: دیوتا کو سب حق حاصل ہوتے ہیں۔ دیوتا کے اختیار کی حد مقرر نہیں کی جا سکتی۔

اگنی دیوتا: وہ ارادہ پاکیزہ ہوتا ہے جو دیوتا کو قبول ہو۔
راجہ نل: پھر انسان کا کیا مقام ہوا؟ انسان کا حق بھی کوئی معنی رکھتا ہے یا نہیں!
پون: انسان دیوتا سے بے نیاز ہو جائے تو پھر اسے کوئی حق حاصل نہیں رہتا۔
(اس گفتگو کے دوران پون دیوتا نے بازی کی کچھ گوٹیں جل دیوتا کے ہاتھ میں تبدیل کر دی ہیں۔ راجہ نل اس بے ایمانی کو دیکھ کر بھڑک اٹھتا ہے)
راجہ نل: (کڑکتے ہوئے) کیا دیوتا کو یہ حق بھی حاصل ہے کہ وہ انسان سے ٹھگی کرے اور اسے دھوکہ دے۔ پون دیوتا نے ہماری باتوں کے وقت گوٹوں کی جگہ بدل دی ہے۔
اگنی دیو: راجکمار نل ــــ آپ دیوتاؤں کی توہین کر رہے ہیں۔ اس کا انجام آپ کے حق میں برا ہوگا۔
راجہ نل: مجھے یہ معلوم ہو چکا ہے کہ دیوتا میرے لیے کیا نیک جذبات رکھتے ہیں۔ اب مجھے دیوتاؤں سے اپنی بھلائی کی امید نہیں۔
بھیم: راجکمار۔ مجھے یہ بات پسند نہیں کہ آپ ایسے نیک موقع پر ایسی باتیں کریں جس سے دیوتاؤں کی توہین ہو اور انھیں غصّہ آئے ــــ آپ طاقت رکھتے ہوں گے لیکن مجھ میں دیوتاؤں کو ناراض کرنے کی ہمّت نہیں۔ بہتر ہو کہ آپ اس.....
(دمینتی عین اس وقت آ کر بول اُٹھتی ہے۔)
دمینتی: یہاں کیا کہرام بپا ہے ــــ؟ راجکمار نل اور جل دیو کی بازی میں جیت کس کی ہوئی ہے۔؟
جل دیوتا: میں نے بازی جیت لی۔
راجہ نل: ابھی بازی کا فیصلہ نہیں ہوا ــــ
اگنی دیوتا: فیصلہ کیسے نہیں ہوا۔؟ جل دیو آخری پانسہ پھینکنے والا ہے اور اس کا آخری پانسہ جیت والا پانسہ ہوگا۔
دمینتی: ہو سکتا ہے کہ نہ جیتے۔
جل دیوتا: کیسے نہیں جیتوں گا۔ میں ابھی پانسہ پھینکتا ہوں۔
راجہ نل: (اس کا ہاتھ پکڑ کر) پانسہ پھینکے جانے سے پہلے ان گوٹوں کی جگہ بدلے جانے کا فیصلہ

ضروری ہے ۔ جنھیں پون دیو نے بدل دیا ہے ۔

دمینتی : (مسکراتے ہوئے) چلو بازی بیچ میں ہی ختم کی جاتی ہے ۔ (راجہ بھیم سے) پتا جی سب مہمانوں کو جمع کر لیا جائے شاہی سنگھاسن کے پاس ۔ میں نے ۔ جے مالا ڈالنے ارادہ کر لیا ہے ۔

جل دیوتا : لیکن پہلے یہ بازی ختم ہونی چاہیے ۔ راجکمار نل سے کہیے کہ وہ پانسہ میرے ہاتھ میں تھما دے اور میں پانسہ پھینکوں ۔ آخری ہاتھ پر بازی ختم کر دینا مناسب نہیں جبکہ میری جیت یقینی ہو چکی ہے ۔

دمینتی : مہاراج جل دیو ــــ پہلی بات تو یہ ہے کہ راجکمار نل نے الزام لگایا ہے کہ پون دیو نے گوٹوں کی جگہ تبدیل کر دی ہے ۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ آپ کا ہاتھ آپ کی خواہش کے مطابق پڑے گا ۔ آپ بیشک ایک طاقتور دیوتا ہیں لیکن اس دنیا میں مستقبل اتنا طے شدہ نہیں جتنا آپ سمجھے بیٹھے ہیں ۔ (مسکراتی ہے) اور تیسرے میری سکھی کلپنا اب یہاں کھڑی ہے اور آپ کی چال میں رکاوٹ ڈال سکتی ہے ۔ ہاں تو پتا جی اعلان کر دیا جائے ۔

بھیم راج کا ساتھی : سازندو ساز چھیڑو تا کہ خاموشی کے بعد اعلان کیا جا سکے ۔

(خوشی کا نغمہ چھیڑا جاتا ہے ۔ سازوں کے خاموش ہونے کے بعد ۔)

اعلان : دور دراز کے مقامات سے آئے ہوئے معزز راجاؤ اور راجکمارو! سب سے یہ التماس ہے کہ وہ راج سنگھاسن کے پاس آکر دو قطاروں میں اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ جائیں ۔ عظیم راجہ بھیم سین کی بیٹی راجکماری دمینتی جس کی خوبصورتی اور پاکدامنی کی شہرت سارے بھارت ورش میں پھیلی ہوئی ہے یہاں موجود معزز راجوں اور راجکماروں کو دیکھ چکی ہے اور بہت سے راجوں اور راجکماروں سے وہ بات بھی کر چکی ہے ۔ اب وہ اگلے چند لمحوں میں اپنی پسند کے راجکمار کے گلے میں جے مالا ڈالے گی ۔

(تھوڑی دیر میں منڈپ میں آئے ہوئے سب راجے اور راجکمار دو قطاروں میں بیٹھ جاتے ہیں ۔ اتفاقیہ طور پر راجہ نل کی نشست جل اور اگنی کے پیچھے اور پون سے آگے ایک ہی قطار میں ہے ۔

دمینتی راج سنگھاسن کے پاس اپنی سکھیوں کے ساتھ کھڑی ہوئی
اس جگہ کو تابندہ کر رہی ہے۔ راج سنگھاسن پر مہاراج بھیم سین
بیٹھے ہیں۔)

دوسرا اعلان: راجکاری کی جانب سے کسی راجکار کے گلے میں جے مالا ڈالنے سے پہلے یہ
اعلان کیا جاتا ہے کہ راجوں اور راجکاروں کو دعوت نامے بھیجتے ہوئے ان باتوں
کو چاہے دھیان میں رکھا گیا تھا پھر بھی اگر کسی معزز شخص کو یہاں موجود کسی راجہ
یا راجکار کے خاندان، رتبہ، مقام، جائیداد، جسم، عقل، چلن وغیرہ کے بارے میں
کوئی شک ہو تو وہ اس بھرے جلسے میں اُسے ظاہر کرے تاکہ ان جانے میں راجکاری
کی طرف سے انتخاب میں کوئی غلطی نہ ہونے پائے۔

(بائیں طرف کی قطار میں دور سرے پر ایک نوجوان راجکار اپنا
شک ظاہر کرنے کے لیے کھڑا ہو جاتا ہے۔)

سوتر دھار: ہاں راجکار ابھی۔ آپ کو کیا اعتراض ہے؟

راجکار ابھی: راجکار بھوانی گڑھ اسی قطار میں کہیں موجود ہیں۔ وہ اپنی ماں کی جانب سے کشتری
نسل سے نہیں ہیں۔ ان کا جنم دو نسلوں کے میل سے ہے۔

سوتر دھار: (پاس پڑے ہوئے پتروں کو دیکھ کر اور کچھ سوچ کر) آپ کا الزام جائز نہیں۔
راجکار بھوانی گڑھ کی ماتا کی نسل کے کشتری ہونے میں کوئی شک نہیں۔ پروہتوں
کی طرف سے اس کا فیصلہ ہو چکا ہے۔

(اُسی قطار میں سے ایک اور راجہ اٹھتا ہے)

سوتر دھار: ہاں راجہ بن کھنڈ۔ آپ کو کیا اعتراض ہے؟

راجہ بن کھنڈ: اس جلسہ میں موجود راجکار پرمیندر کا بایاں بازو ٹوٹ کر ٹیڑھا جڑا ہوا ہے۔ وہ
صحیح تیر اندازی نہیں کر سکتے۔

(راجکار پرمیندر اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔)

راجکار پرمیندر: (بازو اٹھا کر کلائی ننگی کر کے دکھاتے ہوئے) یہ سچ ہے کہ ایک دن شکار کے
دوران ایک پیڑ کی شاخ سے ٹکرا کر میرا بازو ٹوٹ گیا تھا لیکن اب وہ بازو کئی مہینے
سے ٹھیک ہے اور سیدھا جڑا ہوا ہے۔ اگر کسی کو شک ہو تو وہ میرا بازو دیکھ سکتا

ہے۔ میں راجہ بن کھنڈ کو للکارتا ہوں کہ وہ میرے ساتھ کلائی پکڑنے کا مقابلہ کرکے اپنا شک دور کرلے۔

(راجہ بن کھنڈ چلا کر راجکمار پرمیندر کمار کے پاس آجاتا ہے۔)

سوتر دھار: اگر راجہ بن کھنڈ راجکمار پرمیندر سے کلائی پکڑنے کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں تو ان سے یہ درخواست ہے کہ وہ راج سنگھاسن کے قریب آجائیں۔

(راجہ بن کھنڈ اور راجکمار پرمیندر دونوں راج سنگھاسن کے پاس آجاتے ہیں۔ ان میں کلائی پکڑنے کا مقابلہ ہوتا ہے۔ دونوں برابر رہتے ہیں یعنی راج بن کھنڈ راجکمار پرمیندر سے اور راجکمار پرمیندر راج بن کھنڈ سے اپنی اپنی کلائی چھڑا لیتے ہیں۔)

سوتر دھار: ثابت ہوگیا کہ راجکمار پرمیندر کے بازو میں کوئی نقص نہیں۔ اس لیے اُن کو سوئمبر میں حصہ لینے کا پورا حاصل ہے۔

(دائیں قطار میں سے پون دیوتا اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے)

سوتر دھار: (اونچی آواز) پون دیو مہاراج - آپ کو کیا اعتراض ہے اور کس پر ہے—؟

پون دیوتا: مجھے یہ اعتراض ہے کہ اس جشن میں موجود راجکمار نل اپنے شاہی خزانے کا پورے طور پر مالک نہیں رہا۔ وہ جوئے میں ہار کر اپنی سلطنت کی ساری دولت میرے پاس رہن رکھ چکا ہے۔

(راج سنگھاسن کے پاس کچھ شور اٹھتا ہے اور اچنبھے کا اظہار کیا جاتا ہے۔ راجکماری کے چہرے کی سُرخی سے اس کا شرم و حجاب عیاں ہے۔ عین اُس وقت اگنی دیو بھی کھڑا ہو جاتا ہے)

سوتر دھار: اگنی دیو مہاراج — آپ کو کیا اعتراض ہے اور کس پر ہے ؟

اگنی دیو: مجھے یہ اعتراض ہے کہ راجکمار نل چوپڑ کی دوسری بازی مجھ سے ہار کر اپنی سلطنت کی ساری نباتاتی دولت میرے پاس رہن رکھ چکا ہے۔ اس طرح راجکمار کی ملکیت اور بھی کم ہو جاتی ہے۔

(راج سنگھاسن کے نزدیک شور اور حیرت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ راجہ بھیم، سوتر دھار، راجکماری دمینتی اور اس کے بھائی سمیر کے

درمیان کا ناپھوسی ہونے لگتی ہے۔ ان میں دمینتی بھی کوئی بات
کہہ دیتی ہے۔)

سوتر دھار: (کچھ وقفے کے بعد) یہ طے پایا ہے کہ اس منڈپ میں راجکمار نل کے ہارنے کا کوئی فیصلہ نہیں ہوا۔ اور اس کے علاوہ راجکمار نل کا خزانہ اور نیا تاج دولت پون دیو اور اگنی دیو کے پاس رہن ہے فروخت نہیں ہوئی۔ اور ابھی یہ فیصلہ ہونا ہے کہ رہن رکھی گئی دولت وہ کتنی دولت دے کر واپس لے سکتے ہیں۔ ان کو سوئمبر میں شمولیت کا پورا حق حاصل ہے۔

جل، اگنی اور پون: راجکمار نل سے رعایت کی جا رہی ہے۔

(بھیم راج خوف زدہ ہو کر سنگھاسن سے اٹھتے ہیں اور دیوتاؤں کے پاس جاکر کچھ کہہ سن کر انھیں خاموش کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد وہ پھر راج سنگھاسن پر آبیٹھتے ہیں۔

سوتر دھار: (بلند آواز میں) اب راجکماری دمینتی جس کی خوبصورتی اور پاکیزگی کی شہرت ساری دنیا میں پھیلی ہوئی ہے خود چل کر اپنے بر کے گلے میں جے مالا ڈالے گی۔

(دمینتی سنگھاسن سے آگے بڑھ کر بائیں قطار کی طرف جاتی ہے۔ سکھیاں اس کے ساتھ ساتھ چل رہی ہیں۔ دمینتی کے چال میں شوخی اٹھکھیلیاں اور شرم و حجاب ہے۔ دو چار قدم چل کر وہ رک سی جاتی ہے اور راجوں اور راجکماروں کے دل دھڑکنے لگتے ہیں۔ جب سکھیاں اس سے آملتی ہیں تو وہ آگے بڑھتی ہے اس طرح چلتی ہوئی وہ بائیں قطار سے گزر کر دائیں قطار کے دوسرے سرے پر پہنچ جاتی ہے۔ وہاں کچھ دیر رک کر وہ ساری قطار پر نظر دوڑاتی ہے اور پھر آگے بڑھتی ہے۔ جب وہ پون اور نل کے پاس پہنچتی ہے تو ٹھٹھک جاتی ہے۔)

دمینتی: (سکھی سے) کامنا۔ یہ کیا تماشہ ہے۔ یا میری عقل کو کچھ ہو گیا ہے۔ مجھے یہ چاروں صورتیں ایک جیسی نظر آرہی ہیں۔ میرا سر چکرا رہا ہے۔

کامنا: دھیرج سے کام لیجیے راجکماری جی۔ آپ گھومتے گھومتے تھک گئی ہیں۔ دیکھیے یہ پہلا شخص

راجہ پون دیو ہے۔ دوسرے راجکمار نل ہیں۔ تیسرے راجہ اگنی دیو۔ اور......

دمینتی : مگر میں تمہارے کہنے پر کیسے کسی کے گلے میں جے مالا ڈال دوں۔ جب تک مجھے ہوش نہیں آتا تب تک میں کچھ نہیں کروں گی۔ میں یہیں کھڑی رہوں گی۔

کلپنا : مگر راجکماری جی۔ یہاں کھڑے رہنا مناسب نہیں۔ آگے بڑھیے۔ آپ جتنے چکّر جی چاہے کاٹ سکتی ہیں۔ دوسرے چکّر پر تیسرے پر جب چاہیں اپنی پسند کے مرد کے گلے میں جے مالا ڈال سکتی ہیں۔

دمینتی : تم ٹھیک کہتی ہو۔ (آگے چل پڑتی ہے۔)

(جب راجکماری دمینتی دوسری قطار کے سنگھاسن والے سرے پر آجاتی ہے یعنی دونوں قطاریں پار کر چکی ہوتی ہے اور ابھی تک اس نے اپنا دولھا چُنا نہیں ہوتو سارے منڈپ میں حیرت اور بیتابی کا ماحول پیدا ہوجاتا ہے۔)

سمیر : (دمینتی کے راج سنگھاسن کے پاس آجانے پر) کیوں بہن۔ چکّر خالی گیا۔ کوئی ہرن جال میں نہیں پھنسا ؟

دمینتی : (خاموش رہتی ہے)

کلپنا : ہرن تو سبھی جال میں آنے کو تیار کھڑے ہیں لیکن جس ہرن کی تلاش ہے وہ نظروں سے اوجھل ہوگیا معلوم ہوتا ہے۔

سمیر : وہ کیسے ؟ کسی نے جادو ٹونا کر کے اسے غائب تو نہیں کر دیا۔

کلپنا : ایسے وقت میں سب کچھ ممکن ہوتا ہے۔

(اتنے میں دمینتی پہلی قطار کے آگے سے گزرنے لگتی ہے اور کلپنا لپک کر اس سے جا ملتی ہے)

سمیر : (راجہ بھیم سے) مہاراج یہ دیوتا لوگ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی فتنہ جگانے بیٹھے ہیں۔ دمینتی بہن بہت گھبرائی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

بھیم : ہاں کمار۔ ان دیوتاؤں سے سب کچھ ممکن ہے۔ یہ انسان کے حسن کے دشمن ہیں۔

سمیر : ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ دمینتی بہن کے پیچھے پنجے جھاڑ کر پڑے ہوئے ہیں۔ آج کے جلسہ میں ساری گڑبڑ ان دیوؤں کی پھیلائی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

بھیم : ہاں۔کبھی ہوا کا تیز جھونکا آجاتا ہے اور شامیانے گرنے لگتے ہیں۔کبھی آسمان پر بادل چھا جاتے ہیں اور کبھی رسوئی کے پاس آگ لگ جاتی ہے۔

سمیر : یہ سب ان دیوتاؤں کی شرارت ہے۔

بھیم : مگر ہم بے بس ہیں۔ان کے مقابلے میں کمزور ہیں۔

سمیر : کمار نل توان کا مقابلہ کر رہے ہیں۔

بھیم : جبھی نل دو بازیاں ہار چکا ہے اور اپنی سلطنت کا خزانہ اور نیا تاتی دولت ان دونوں کے پاس رہن رکھ چکا ہے۔

سمیر : لیکن کمار نل تیسری بازی جیت گئے ہیں اس لیے وہ پہلی دو بازیاں کٹ گئیں۔

بھیم : کمار نل تیسری بازی جیت گئے؟ وہ کیسے—؟ میں نے تو سنا ہے کہ تیسری بازی جل دیو نے جیتی تھی اور دمینتی نے جا کر کھیل بند کرا دیا تھا۔

سمیر : بات یہ ہوئی کہ پون دیو نے راجہ نل کی جیتی ہوئی گوٹیں آنکھ بچا کر اپنی جگہوں سے بدل دی تھیں۔کلپنا نے یہ چوری دیکھ لی اور کمار نل کو اس دھوکے سے آگاہ کر دیا—
لیکن مہاراج ذرا دیکھیے تو سہی کہ دمینتی بہن دوسری بار پہلی قطار سے گزر کر وہاں دوسری قطار میں جہاں دیوتا لوگ بیٹھے ہیں جا کر رک گئی ہے۔

بھیم : وہ وہاں جا کر کیوں رک گئی ہے؟ کیا کسی دیوتا کو اپنا بر چننا چاہتی ہے؟

سمیر : نہیں — راجکمار نل بھی ان دیوتاؤں کے درمیان بیٹھے ہیں۔

بھیم : تو کیا وہ راجکمار نل کو چننا چاہتی ہے—؟ یہ تو بڑی غیر دانشمندی کی بات ہوگی— راجکمار نل پر تو دیوتاؤں کا عذاب نازل ہو چکا ہے۔

سمیر : لیکن دیوتاؤں کے عتاب کی وجہ بھی تو بہن دمینتی ہے۔وہ دیکھیے بہن دمینتی نے راجکمار نل کے گلے میں جے مالا ڈال دی ہے۔

("راجکمار نل کی جے" کے نعرے لگتے ہیں۔ان نعروں سے سارا منڈپ گونجنے لگتا ہے۔دمینتی کا بھائی سمیر اور دیگر درباری ان نعروں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔پھر زور سے ہوا چلتی ہے —— اور شامیانے گرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں لیکن کسی وجہ سے وہ گرتے نہیں۔جگہ جگہ لوگ ستونوں کو تھامے ہوئے

کھڑے ہیں۔ دمینتی اور نل مل کر ایک ستون کو سہارا دے رہے ہیں۔ منڈپ میں سے تمام راجے، راجکمار اور تینوں دیوتا آہستہ آہستہ کھسک جاتے ہیں۔ وہاں صرف راجکمار نل، اس کے چند بہی خواہ راجے، راجکمار اور بھیم راج کے مہمان، مصاحب اور عورتیں رہ جاتی ہیں۔ منڈپ کی رونق ان سے قائم رہتی ہے۔ موسیقی کی دھنیں اب لطف انگیز ہوگئی ہیں۔)

پردہ

پانچواں ایکٹ

راجہ نل کے راج بھون کا ایک کمرہ جہاں بیٹھ کر راجہ نل نظم و نسق کے کام نپٹاتا ہے۔
راجہ نل، منتری، سچیو اور رانی دمینتی وہاں موجود ہیں۔

سچیو : مہاراج ! جنگلاتی علاقہ سے بہت تشویشناک خبریں آرہی ہیں۔ جنگلوں کو آگ نے بہت نقصان پہنچایا ہے۔

دمینتی : ہاں۔ اگنی دیو اپنی طاقت کا مظاہرہ کر رہا ہے۔

منتری : میری رائے میں تو یگیہ کرنے سے اِن آگوں کو ٹھنڈا پڑ جانا چاہیے تھا۔

راجہ نل : اگلے یگیہ کی تاریخ کون سی طے پائی ہے ؟

سچیو : مہاراج۔ اس مہینے ساون کی سولہ تاریخ !

دمینتی : آپ نے کچھ ڈھیل دے دی سچیو ! یہ یگیہ اس مہینے کی سنکرانت کو ہو جانا چاہیے تھا۔

راجہ نل : کیا یہ یگیہ ذرا پہلے نہیں کیا جا سکتا ؟

دمینتی : زیادہ تو نہیں مگر ایک ہفتہ پہلے کیا جا سکتا ہے۔

راجہ نل : تو ضرور کیجیے — یگیہ ساون کی ساتویں آٹھویں تاریخ کا طے کر دو۔ اور اس کی اطلاع ابھی ہر جگہ پہنچ جانی چاہیے۔

سچیو : کل تک ہر جگہ اطلاع پہنچ جائے گی مہاراج۔

دمینتی : منتری جی ! نباتاتی دولت کو اگنی دیو کے قبضہ سے آزاد کرانے کے مضبوط اقدامات کیے جانے چاہئیں اور جلد کیے جانے چاہئیں۔

منتری : مہارانی جی ! ابھی اس واقعہ کو چھ مہینے بھی نہیں ہوئے۔ ہم تو اسی دن سے اس بات کی فکر میں ہیں لیکن اس تھوڑی سی مدت میں کوئی ٹھوس بات ممکن نہیں ہو سکی۔

راجہ نل : آپ نے اس رہن سے چھٹکارا پانے کے کیا طریقے سوچے ہیں منتری جی ؟

منتری : پہلا اور اہم طریقہ تو یہ ہے مہاراج کہ سوکھے پیڑ کٹوا کر گھروں کے شہتیر اور کڑیاں اور سکھ کا دیگر ساز و سامان بنوایا جائے تاکہ رعایا کا رہن سہن اور زیادہ بہتر ہو جائے۔

پیڑوں کے درمیان فاصلہ بڑھ جائے گا اور اس طرح شاخوں کی رگڑ سے آگ لگنے کا امکان کم ہو جائے گا۔ رہن نامہ میں سوکھے پیڑ کٹوانے کا ہمیں حق حاصل ہے۔

راجہ نل: کیا ہمارے پاس پیڑ کاٹنے والی رعایا کو مناسب اُجرت دینے کی صلاحیت ہے؟

منتری: اصل میں پیڑ کاٹنے والی سب رعایا کو تو اُجرت نہیں دی جاتی۔ مگر ان کو اپنے گھروں کے لیے لکڑی دے دی جاتی ہے ـــــ

راجہ نل: کیا اس سے رعایا مطمئن ہو جاتی ہے؟

منتری: کچھ لوگ مطمئن ہو جاتے ہیں اور کچھ نہیں۔ وہ بڑبڑاتے رہتے ہیں مگر مہاراج کیا کیا جائے؟ ساری رعایا کو مطمئن کرنا حکومت کی استعداد سے باہر ہے ـــــ

دمینتی: منتری جی! کیا کبھی ایسا زمانہ بھی آئے گا جب حکومت ساری رعایا کو مطمئن رکھنے کے قابل ہو گی؟ جب کوئی اپنے کام کے لیے پیسہ مانگے گا تو اُسے مہیا کر دیا جائے گا۔ اور اگر وہ کوئی اور چیز مانگے گا تو اسے وہ بھی مل جائے گی۔

منتری: بھگوان کا نام لیجیے مہارانی جی۔ اس سنسار میں اتنی سہولت ممکن نہیں۔ بہت سی رعایا کو تو اگلے جنم یا سورگ (بہشت) کے خیالی آرام و آسائش ہی سے مطمئن کیا جا سکتا ہے۔

دمینتی: اور وہ مطمئن ہو جاتے ہیں؟

منتری: کبھی کبھی ناراض بھی ہو جاتے ہیں مہارانی۔ لیکن ان میں سے اکثر مان بھی جاتے ہیں ـــ اور کریں بھی کیا؟

سیجیو: سنسار دکھوں کا گھر ہے ـــ مہارانی! یہاں ہر کسی کو دکھ جھیلنا پڑتا ہے۔ اس لیے پرجا کو بھی اپنی قسمت کا دکھ اٹھانا پڑتا ہے۔

دمینتی: سیجیو ـــ رعایا کی قسمت میں لیکن دکھ کچھ زیادہ ہی ہوتے ہیں۔ کشتری، راجہ اور برہمن کی قسمت میں سکھ کا حصہ ذرا زیادہ ہے۔

منتری: اسے ہی تو کرموں کی بات کہا جاتا ہے۔ مہارانی! وہی نظریہ سچا ہے جو حالات کے مطابق ہو۔ اس دنیا میں رعایا کے دکھوں کا کوئی ظاہر اور جانا پہچانا سبب تو معلوم نہیں ہوتا ـــ اس لیے کوئی اَن جانا اور اَن دیکھا سبب ضرور ہو گا۔

دمینتی: نہ بھی ہو ـــ مگر ماننا پڑتا ہے۔

منتری : وہی بات ہے نا۔ اس دنیا کی صورتِ حال کا کسی اور طریقہ سے تجزیہ نہیں کیا جا سکتا۔
دمینتی : مگر راجہ کو اپنی رعایا کے دکھ کا حصّہ بانٹنا چاہیے۔
منتری : راجہ لاکھ نہ چاہے مگر اسے رعایا کا دکھ بانٹنا پڑتا ہے۔ آپ اپنی حالت پر ہی غور کیجیے۔ اگر بارش نہیں ہوتی تو فصل تباہ ہو جاتی ہے۔ آگ لگ جاتی ہے تو نباتات برباد ہو جاتی ہے۔ ایسی حالت میں راجہ سکھ کہاں سے حاصل کرے گا ؟ ایک برس نہیں تو دوسرے برس کے بعد اس موقع پر سوکھے اور آگ کی تپش وہ بھی محسوس کرے گا۔
دمینتی : اگر اس صورتِ حال پر جلد قابو نہ پایا گیا تو ہمیں بھی اس تپش کے لیے تیار رہنا ہوگا منتری جی !
منتری : ضرور تیار رہنا ہوگا مہارانی۔
راجہ نل : پیاری — تم ان بکھیڑوں میں کیوں پڑتی ہو — ؟ ہم آنے والے مصائب کو ٹالنے کا سامان کر لیں گے۔ اور جنگل کی آگ کی لپٹ کو اس راج بھون تک نہیں پہنچنے دیں گے۔
سچیو : دوسرا تشویشناک واقعہ اس دیس میں برسات کی کمی ہے مہاراج۔
منتری : ہاں مہاراج — اس بار بارش کو کچھ زیادہ ہی تاخیر ہوئی جا رہی ہے۔ سارا اساڑھ برکھا کے بغیر بیت گیا ہے — اور جیوتشی کہہ رہے ہیں کہ اس مہینے بھی برسات کا زیادہ امکان نہیں ہے۔
دمینتی : اچھا تو پون دیو بھی اپنی طاقت کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔!
منتری : کیا بتائیں مہارانی جی۔ ہوا تو جیسے اس دیس میں پانی نہ لانے کی قسم کھا چکی ہے۔ صرف گرم جنوبی ہوا چلتی ہے۔ آسمان میں بادل کا کوئی نقش تک دکھائی نہیں دیتا۔
دمینتی : منتری جی سچ تو یہ ہے کہ ہم اپنی کھیتی کو ابھی تک پون کے قبضہ سے آزاد نہیں کرا سکے۔
منتری : اصل میں میری یہی التجا ہے مہارانی جی کہ اتنے تھوڑے عرصہ میں رہن رکھی ہوئی دولت کو چھڑانے کی طاقت ہم میں نہیں ہے۔
راجہ نل : لیکن منتری جی یہ طاقت ہمیں حاصل کرنی ہوگی۔
منتری : مہاراج — ہم بہت سے جتن کر رہے ہیں مگر چھ مہینے کا عرصہ زیادہ لمبا عرصہ نہیں کہ

ہم جس میں کوئی بھاری کامیابی حاصل کر سکتے۔

راجہ نل : کھیتوں کے لیے کنوؤں کی تعمیر کا کام کس حد تک ہو چکا ہے ؟

منتری : مہاراج۔ ان چھ مہینوں میں صرف پانچ سو کنوئیں تعمیر ہوئے ہیں۔

دمینتی : پانچ سو کنوؤں سے پانچ ہزار ایکڑ زمین پون دیو کے قبضہ سے آزاد کرائی جا سکتی ہے اور پانچ ہزار ایکڑ زمین پر صرف دس ہزار لوگوں کی گزر میسر ہو سکتی ہے۔

سپچیو : ٹھیک ہے ـــــ مہارانی جی! آپ نے بہت اچھا اندازہ لگایا ہے۔

دمینتی : اس حساب سے تو ہم سینکڑوں سال میں بھی اپنی کھیتی اور اپنی رعایا کو پون دیو کے قبضہ سے آزاد نہیں کرا سکیں گے۔

منتری : بالکل بجا فرمایا مہارانی جی ـــــ اصل میں چوپڑ کے کھیل میں جیت کر پون دیو نے رہن نامے پر صرف مہاراج کی منظوری کی مہر ہی لگوائی ہے ویسے تو ہماری کھیتی ابد سے پون دیو کے پاس رہن چلی آ رہی ہے۔

راجہ نل : اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ محض کنوئیں بنانے سے ہی ہمیں نجات حاصل نہیں ہو سکتی۔

سپچیو : یہ کنوئیں بھی آخر کتنے مؤثر ثابت ہو سکتے ہیں ـــــ ان میں سے بہت سے تو کچے ہی رہ جاتے ہیں ـــــ رعایا کے ایک بڑے حصّے کے پاس ان کنوؤں میں پکّی اینٹیں لگانے کی استعداد نہیں ہے۔

راجہ نل : کیا ہم اس کام میں رعایا کی مناسب امداد نہیں کر سکتے ؟

منتری : ہم کیا امداد کر سکتے ہیں مہاراج۔ ہم رعایا کی ضرورت کے مطابق کتنی اینٹیں پکا سکتے ہیں۔؟ یہ کام صرف نباتاتی دولت سے نہیں چل سکے گا ـــــ معدنی ایندھن بھی چاہیے اور معدنی راکھ بھی۔

راجہ نل : اینٹیں پکانے کے لیے اور کیا انتظامات کیے جا سکتے ہیں ؟

منتری : بہت کم مہاراج۔ ہم نے رعایا کو اینٹیں پکانے کے لیے جنگل میں سے لکڑی کاٹ کر لانے کی رعایتیں دے رکھی ہیں۔ جنگل میں آگ کو روکنے کے لیے رعایا کی امداد حاصل کی گئی ہے۔ اس پر بھی کھدے ہوئے سو کنوؤں میں سے بمشکل ایک کنوئیں کو پکّا کیا جا سکتا ہے۔

سپچیو : اور پھر ایک پکے کنوئیں سے سارا سال دس ایکڑ زمین کی سینچائی نہیں ہو سکتی۔ کئی کنوؤں

پر چرس کھینچنے کے لیے بیلوں کی جوڑیاں بھی نہیں ہیں۔ بہت جگہوں پر جہاں پانی کی سطح نزدیک ہے رعایا خود ہی چرخی اور دیگر طریقوں سے پانی نکال لیتی ہے۔

راجہ نل: منتری جی کیا ہم اس کام کو نہر اور رجباہے نکال کر بہتر نہیں بنا سکتے ؟

منتری: مہاراج ایک رجباہے پر بھی کام ہو رہا ہے۔

دمینتی: میری رائے تو یہ ہے کہ رجباہوں سے اس کام میں سدھار ہو سکتا ہے۔ ہمیں مزید رجباہے کھودنے پر اپنا پورا زور لگا دینا چاہیے۔

راجہ نل: ہاں منتری جی ۔ کیا ہم رجباہے کھودنے کا کام شروع نہیں کر سکتے ؟

منتری: مہاراج ۔۔ دشواری تو یہی ہے کہ خزانہ خالی ہے۔ رجباہے کھودنے والے لوگوں کو مناسب اُجرت کہاں سے دیں۔

راجہ نل: کیا رعایا کو ان کے فائدوں کے لیے ایسا کرنے پر اُبھارا نہیں جا سکتا ؟

منتری: جو زمین ابھی رعایا میں کھیتی کے لیے بانٹی نہیں گئی اُس زمین پر رجباہے کھودنے کا کام ہم آسانی سے کر سکتے ہیں۔ اس زمین پر ہم رجباہے اس بنیاد پر کھُدوا سکتے ہیں کہ جو لوگ رجباہے کھودیں گے ان میں وہ زمین تقسیم کر دی جائے گی۔

دمینتی: پھر تو یہ کام ضرور اور جلد کرنا چاہیے۔

منتری: اگر مہاراج کی اجازت ہو تو ہم ایسا ایک منصوبہ بنا سکتے ہیں۔

راجہ نل: ہاں۔ ایسا کرنے میں سستی اور کاہلی نہیں کرنی چاہیے۔ اس نئی زمین کو آباد کرنے کے لیے ہم اپنی راجدھانی بھی وہاں لے جا سکتے ہیں۔

منتری: ٹھیک ہے مہاراج۔ قحط کے زمانے میں اس نگر پر آفت آ سکتی ہے ۔۔ راجدھانی کے لیے رجباہوں سے سیراب ہونے والی زمین ہی مناسب رہے گی۔

دمینتی: ہاں ۔ اس نگر پر دشمن دیوتاؤں کی پرچھائیں پڑ چکی ہے۔ اس وقت ہمیں مقام تبدیل ہی کر لینا چاہیے۔

منتری: شاہی خاندانوں کی یہ روایت بھی ہے ۔ نیا پریوار اور نیا گھر ۔۔۔

(سب مسکرا پڑتے ہیں)

سیچیو: اور مہاراج ۔ کچھ خبریں دستکاری کے کاموں کے بارے میں بھی سُن لی جائیں۔

راجہ نل: ہاں ۔ ادھر بھی زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ ودربھ جانے سے پہلے ہم نے اس

شعبے کا صدر رویشنکر کو بنایا تھا۔ پشنکر ذہین اور ہوشیار ہے مگر ضرورت سے زیادہ

سپچیو : دستکاری کے کاموں میں اس دیس میں کپڑے کے کام میں کافی اضافہ ہوا ہے۔ مگر اس سے ٹیکس اور محصول میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہوا۔

راجہ نل: پشنکر کہتا ہوگا کہ بنکروں کو کئی طرح کی رعایتیں دینی پڑی ہیں۔ ان پر ٹیکس کم کیے گئے ہیں جبھی ان کے کام میں اضافہ ہوا ہے۔

سپچیو : بڑی وجہ یہی ہے کہ محصول اور ٹیکس میں اضافہ نہیں ہوا۔ مہاراج یہ بتایا گیا ہے کہ اگرچہ کپڑا زیادہ بنا گیا ہے لیکن وہ پہلے کی طرح فروخت نہیں ہوا۔

منتری: اس میں شک نہیں کہ قحط کی وجہ سے رعایا کی قوتِ خرید کم ہو گئی ہے۔

سپچیو : خاص طور پر جب سے گرمی کا موسم شروع ہوا ہے۔ کپڑے کی بکری بہت کم ہو گئی ہے۔

راجہ نل: ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس گرمی کے موسم سے ہی اس حکومت کا زوال شروع ہوا ہے۔

دمینتی : پیارے۔ یہ نہ کہیے۔ آپ کا راج ہمیشہ سلامت رہے گا۔

راجہ نل : ٹھیک ہے مگر دیوتاؤں کی دشمنی ایک سنگدل طاقت ہے۔

دمینتی : ہم دیوتاؤں کی دشمنی پر فتح حاصل کریں گے۔ دور بھ میں چوپڑ کے کھیل میں دیوتاؤں سے مقابلہ کے وقت آپ کی بازی بھی تو بچالی تھی۔

راجہ نل: ایسی ہی ہمت سے دیوتاؤں کی اس دشمنی سے بچ سکیں گے۔

سپچیو : دھاتوں کی پیداوار بھی کم ہوتی جا رہی ہے۔

راجہ نل: اس کی کیا وجہ ہے؟

منتری : یہ کمی بھی گرمی کے اس موسم سے شروع ہوئی ہے۔

سپچیو : اس برس رعایا جنگل کاٹنے میں زیادہ جٹ گئی ہے اس لیے کانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی کچھ کمی ہو گئی ہے۔

راجہ نل: یہ بھی عجب گورکھ دھندہ ہے۔ رعایا کو جنگلات کاٹنے میں لگائیں تو وہ کپڑے کے بیوپار سے ہٹ جاتی ہے اور کانوں میں مزدوروں کی کمی ہو جاتی ہے۔

منتری: سلطنت کی اقتصادی ترقی کی رفتار بڑھانے کے لیے وسیع پیمانے پر دانشمندانہ منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔ ہم سمجھ بوجھ سے کام لیتے ہیں لیکن پھر بھی کچھ خامیاں رہ جاتی ہیں۔ کچھ نئی دشواریوں کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مگر موسم سرما تک

ہم گذشتہ سال کی خامیوں کو دور کرنے کے ذرائع پیدا کرلیں گے۔

راجہ نل: اچھا۔ نمک کی کان کنی کی کیا حالت ہے ؟

سچیو : اس میں بھی گھاٹا پڑ رہا ہے۔

راجہ نل: (گھبرا کر) وہ کیوں ؟ کیا دیوتا کی ناراضگی سے اس برس جھیل کے پانی میں بھی نمک کم ہو گیا ہے ؟

سچیو : مہاراج۔ کنور پشکر راج کا یہی کہنا ہے کہ گزشتہ برس کی نسبت اس برس زیادہ نمک تیار نہیں ہوا۔ حالانکہ پچھلے برسوں میں ہم جتنا نمک نکالتے تھے گزشتہ برس اس سے بہت زیادہ نمک نکالا گیا تھا۔ پانی کچھ ایسے ذرائع سے حاصل کیا گیا تھا جہاں نمک نسبتاً زیادہ تھا۔ اس برس نمک حاصل کرنے کے لیے ہلکا پانی ہی میسر آیا ہے

راجہ نل: یہ کیسے ہو سکتا ہے ؟ جھیل کا پانی الگ الگ نالوں میں تو تقسیم نہیں ہوا ہے کہ ایک میں دوسرے کی نسبت نمک کم یا زیادہ ہو۔

(سچیو خاموش رہتا ہے)

منتری: کیا تو یہی جاتا ہے مہاراج — اس بات میں سچائی بھی ہو سکتی ہے۔

راجہ نل: کس کا یقین کروں اور کس کا نہ کروں — میں پشکر پر کیا شک کر سکتا ہوں — یوں ہی ہو گا۔ اس سال ہر طرف گھاٹا پڑ رہا ہے۔

(دمینتی کی طرف دیکھتا ہے۔ وہ شرما جاتی ہے۔ منتری اور سچیو بھی خاموش رہتے ہیں۔)

راجہ نل : (کچھ وقفہ کے بعد) اچھا منتری جی۔ آپ اور سچیو جا سکتے ہیں۔ ہم کچھ دیر آرام کریں گے۔

(منتری اور سچیو چلے جاتے ہیں)

دمینتی : (قریب آکر) پیارے۔ آپ کو اس طرح ناراض ہو جانا زیب نہیں دیتا۔ اس کا فائدہ ؟

راجہ نل: میں نے منتری اور سچیو پر کوئی شک نہیں کیا اور نہ ان کے بارے میں میرے دل میں کوئی شک پیدا ہوا ہے۔

دمینتی : کیا آپ کے دل میں پشکر راج کے بارے میں کوئی شک پیدا ہوا ہے۔

راجہ نل : ہاں۔ اس کے بارے میں۔ پشکر مجھ سے دھوکہ کر رہا ہے۔ وہ میرے دشمن دیوتاؤں سے

جا ملا ہے۔

دمینتی : ایسا شک کرنے کے لیے آپ کے پاس کوئی ٹھوس ثبوت ہونا چاہیے۔ بھائی پر شک کرنا مہا پاپ ہے۔

راجہ نل: دیوتاؤں کی دشمنی نے میری ہمّت توڑ کر رکھ دی ہے۔ میری عقل کوئی کام نہیں کر رہی۔

دمینتی : پشکر راج نے کسی طرف سے بھی کوئی فائدہ نہیں دکھایا لیکن پھر بھی ممکن ہے کہ اس میں اس کا کوئی قصور نہ ہو۔ اگر دیوتا کی ناراضگی سلطنت کی زرعی اور نباتاتی دولت پر بُرا اثر ڈال سکتی ہے تو معدنیات بھی اس سے بچ نہیں سکتی۔

راجہ نل: معدنیات اور دستکاری پر دیوتاؤں کا اتنا غلبہ نہیں جتنا زرعی اور نباتاتی دولت پر ہے۔ معدنیات اور دستکاری پر انسان کا تسلّط زیادہ ہے۔

دمینتی : (شوخی سے) ایک اور میدان میں بھی انسان کا حق زیادہ ہے۔

راجہ نل : کس میدان میں ؟

دمینتی : محبت کے میدان میں۔ اس میدان میں بھی انسان نے دیوتاؤں پر فتح حاصل کی ہے۔

راجہ نل: ہاں ـــــ مرد اور عورت نے مل کر۔

دمینتی : یہی بات انسان کو دیوتا سے ممتاز کرتی ہے۔

راجہ نل: اچھا ـــــ مگر کئی دیوتا بھی تو بیاہے ہوئے ہیں۔

دمینتی : مگر ان کو اولاد پیدا کرنے کا وردان حاصل نہیں۔ جو صرف انسان کے نصیب میں ہے۔

(دمینتی اپنے پیٹ کی طرف دیکھتی ہے اور راجہ نل کچھ بھانپ جاتا ہے۔)

راجہ نل : کیا میری قسمت کھلنے والی ہے ـــــ ؟

دمینتی : (مسکرا کر راجہ نل کی باہوں میں جھولتی ہوئی) یہ تو آپ ہی جانیں۔

راجہ نل: جانتی تو تم ہی تھیں ـــــ لیکن اب میں بھی جان گیا ہوں۔

(راجہ نل دمینتی کو باہوں میں بھینچ کر اسے پیار کرتا ہے)

دمینتی : اب آپ کو دیوتاؤں سے کوئی خوف نہیں ہونا چاہیے۔ آپ دیوتاؤں سے زیادہ امر ہیں۔

راجہ نل: ہاں ـــــ انسان سدا نئی نئی صورتوں میں زندہ رہتا ہے۔ اس پر بچپن، جوانی اور

پھر بڑھاپے کا دور آتا ہے۔ بڑھاپے کے بعد پُرانا جسم تیاگ کر وہ اپنی اولاد کی شکل میں نیا جسم حاصل کر کے نئے سرے سے زندگی شروع کر دیتا ہے۔

دمینتی : اور دیوتا کو یہ شرف حاصل نہیں۔

راجہ نل: مگر انسان میں ایک کمی بھی ہے۔

دمینتی : وہ کیا؟

راجہ نل: انسان انسان کو دغا دیتا ہے۔ میرے بھائی پشکرہی کو لو ــــ مجھے شک ہے کہ وہ مجھ سے دھوکہ کر رہا ہے، مجھے دغا دے رہا ہے۔

دمینتی : میرے خیال میں اس بات کا فیصلہ کرنا زیادہ مشکل نہیں۔ آپ اس سے چوپڑ کھیلیے اگر وہ چالاکی سے آپ سے بازی جیتنا چاہے گا تو پتہ چل جائے گا کہ وہ آپ سے دغا کرنے کا جذبہ رکھتا ہے۔

راجہ نل: تم نے یہ طریقہ بہت اچھا بتایا ہے۔ اس بات کو آزماتے ہیں۔ کل اسے یہاں بلا کر چوپڑ کھیلیں گے۔

پردہ

چھٹا ایکٹ

(پہلا منظر)

راجہ نل کے راج بھون کا ایک کمرہ۔ راجہ نل
اور دمینتی موجود ہیں۔ باہر بارش ہو رہی ہے۔
وقت ـــــ دن ڈھلنے کا ہے۔

راجہ نل: میرا شک صحیح ثابت ہوا۔ پشکر بدکردار نکلا۔

دمینتی: اس کی بدنیتی یہ تھی کہ جوئے میں سارا راج پاٹ جیت لوں۔

راجہ نل: ویسے وہ جیت تو گیا ہی تھا مگر تمہارے ہارنے میں اس کی بُری نیت اس کے آگے آگئی۔ کہنے لگا کہ دمینتی کو بھی داؤ پر لگا دو۔

دمینتی: وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ دمینتی کو داؤ پر لگوا کر راجہ نل سے دیوتا بھی بازی نہ جیت سکے۔

راجہ نل: اور مجھے بھی یہ یقین تھا کہ اس نے دمینتی کو داؤ پر لگوایا نہیں اور وہ ہارا نہیں۔ بس پھر کیا تھا۔ ایسی مات کھائی کہ اس نے پہلے جو کچھ جیتا تھا سب لوٹانا پڑا۔ اور اتنا جھنجلایا کہ پھر اس دیس میں اور نہ ٹھہر سکا۔

دمینتی: ٹھہرتا کیسے۔ ؟ ٹیکسوں کی تحقیقات ہوئی تو اس وقت بھی جھوٹا ثابت ہوا۔

راجہ نل: وہ تو تم سے میری شادی کے وقت سے ہی دشمن دیوتاؤں سے ملا ہوا تھا۔

دمینتی: اس گناہگار کو اُن دشمنوں سے جا ملنے کی کیا ضرورت تھی؟ ہم نے تو نو آباد دھرتی پہ راج بھون تعمیر کرلیا ہے اور اسے ہم نے یہاں کا راجپال (گورنر) بنا دیا ہوتا۔ راجپال ہی کیا۔ وہ سلطنت کے اس حصہ کا راجہ ہی ہوتا۔

راجہ نل: دشمن کا ایک وار یہ بھی ہوتا ہے۔ وہ اپنی دشمنی نباہنے کے لیے انسان کے رشتہ داروں کی عقل بھی خراب کر دیتا ہے اور بھائی کو بھائی کا دشمن بنا دیتا ہے۔

دمینتی: اس سے اس کا کچھ بنتا سنورتا تو ہے نہیں۔

راجہ نل: دشمن اپنا کچھ سنوارنے کے لیے ہی کسی کی عقل خراب کرتا ہے۔ دشمن کا مقصد تو یہ

ہوتا ہے کہ وہ کسی کی عقل خراب کر کے اُسے اور اس کے بھائی بندوں کو نقصان پہنچائے

دمینتی : میں تو اسے اپنے ماموں کی بیٹی نندا کا رشتہ لا دیتی۔ نندا بہت خوبصورت ہے۔

راجہ نل : (ہنستے ہوئے) اگر لشکر میدان چھوڑ گیا ہے تو نندا کا رشتہ مجھے لا دو۔

دمینتی : (آہستہ سے چپت لگا کر) ابھی سے آپ ایک اور رشتے کی خواہش کرنے لگے ہیں ؟ مجھے کچھ تو پرانی ہو جانے دیجیے۔ ابھی تو میں صرف ایک بچے کی ماں بنی ہوں —— دو بچوں کے بعد آپ کو میری خوبصورتی بدصورتی نظر آسکتی ہے لیکن ابھی سے تو نہیں۔

راجہ نل : اس ذرا سی بات پر لمبا چوڑا بھاشن دے دیا تم نے۔

دمینتی : (ذرا خفا ہو کر) آپ مرد لوگ کھٹاک سے یہ بات کہہ دیتے ہیں آپ کو شرم، جھجک اور خوف بالکل محسوس نہیں ہوتا۔

راجہ نل : معاف کر دو۔ میرے لیے تو تمہارے سوا کوئی اور حسینہ اس دنیا میں نہیں ہے۔ میں شرمندہ ہوں کہ نندا کے بارے میں ایسی بات کہہ بیٹھا۔ آئندہ میں اسے ہمیشہ اپنی چھوٹی بہن سمجھوں گا۔

دمینتی : جب آپ میرے پیارے نل ہوتے ہیں تو آپ کے خیالات، خواہشات اور ارمان سب پاکیزہ رہتے ہیں لیکن جب آپ کے دل میں روایتی مرد جاگ اٹھتا ہے تو میں آپ کو دمینتی نہیں محض ایک عورت نظر آتی ہوں —— جس کی زندگی کا مقصد مرد کی خواہش کو پورا کرنا ہوتا ہے۔

راجہ نل : دمینتی ! اب تم مجھے اور زیادہ شرمسار نہ کرو۔ میں صدق دل سے معافی چاہتا ہوں۔

دمینتی : میں کیا معافی دوں۔ میں تو سراسر آپ کی دولت ہوں۔ میرا تو غصہ بھی آپ کے پیار سے خالی نہیں ہو سکتا۔ مجھ سے معافی حاصل کرنا آپ کے لیے کیا مشکل ہے۔

راجہ نل : (جو اس کا اشارہ سمجھ گیا ہے دمینتی کو اپنی باہوں میں جکڑ لیتا ہے) ہاں تمہیں ناراض کر کے معافی مانگنا بھی پیار مانگنے کے برابر ہے۔ تمہارا غصہ بھی محبت کا چشمہ ہے۔

دمینتی : (راجہ نل کے قدموں میں گر کر)

بالما! میں تیری ہوں۔ مجھے اپنے قدموں میں جگہ دیے رکھ
میرے انگ انگ کی مٹھاس تیرے لیے ہے۔

راجہ نل : میرے لیے تو تمہاری ایک ہی طرح کی مٹھاس کافی ہے۔ مجھے تمہارے انگ انگ

کی الگ الگ مٹھاس کی ضرورت نہیں۔ میں تو تمہارے سراپا کو اپنے میں جذب کر لینا چاہتا ہوں۔

دمینتی : آدم خور شیر کا مزاج پایا ہے آپ نے۔ مجھ سموچی کو ایک ہی بار میں کھا جانا چاہتے ہو۔

راجہ نل : ایک ہی بار۔ اور بار بار.....

دمینتی : برکھا بہت تیز اور خوفناک ہوتی جا رہی ہے۔ چار دنوں اور چار راتوں سے مسلسل ہو رہی ہے یہ بارش!

راجہ نل : جل دیو میری اس ساری کی ساری نگری کو ایک ہی بار ہڑپ کر لینا چاہتا ہے۔

دمینتی : پہلے آدھے بھادوں تک ایک بوند نہ پڑی۔ ساری فصل تباہ ہو گئی۔ راج میں قحط پڑ گیا۔ جنگل جل کر راکھ ہو گئے۔ اور اب پانی ہی پانی ہے۔ جل تھل! برکھا تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہی ہے۔

راجہ نل : ٹھیک ہے کہ پون اور اگنی سے تو میں ہار چکا تھا اور میری زرعی اور نباتاتی دولت ان کے پاس رہن رکھی گئی تھی مگر میں جل دیوتا سے تو نہیں ہارا تھا۔ وہ اب کس بنا پر میرا نقصان کرنے پر تلا ہوا ہے؟

دمینتی : وہ بھی جانتا ہے کہ اگر میں اوپر سے آ کر کھیل ختم نہ کرا دیتی تو وہ بازی جیت رہا تھا۔

راجہ نل : تو کیا وہ یہ نہیں جانتا کہ تم اب بھی میرے پاس ہو۔

دمینتی : خبر تو ہے مگر اپنا پورا زور لگا کر رہے گا۔

راجہ نل : اس سے پشکر کا مل جانا مجھے بہت خوفزدہ کر رہا ہے۔

دمینتی : یہ قدرتی بات ہے۔ دیوتا سے دشمنی میں اکیلا انسان بہت کمزور ہوتا ہے۔ ایسے وقت میں مرد اور عورت میں پیار بہت طاقتور ہوتا ہے۔ بھائی بھائی، پڑوسی پڑوسی اور انسان انسان میں تعاون بھی بہت ضروری ہوتا ہے۔

راجہ نل : یہ کہاوت یوں ہی تو مشہور نہیں ہوئی — گھر کی پھوٹ بُری — پشکر کے مخالف ہو جانے سے ہمارے گھر میں بھی تو پھوٹ پڑ گئی ہے۔

دمینتی : پشکر ہمارا مخالف کیوں ہو گیا؟ ہم نے تو اس سے کوئی زیادتی نہیں کی تھی۔

راجہ نل : یہ کیا کم زیادتی ہے کہ میں راجہ ہوں اور.....

دمینتی : اور؟

راجہ نل : اور تم بے حد حسین ہو ــــــ! حکومت اور حُسن ہمیشہ انسانوں میں پھوٹ ڈالتے رہے ہیں اور ڈالتے رہیں گے۔
دمینتی : کیوں؟ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔
راجہ نل : کیونکہ سبھی انسان ان دونوں میں ساجھے داری برداشت نہیں کر سکتے۔
دمینتی : حکومت کے بارے میں تو میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔ مجھے اس کا ویسا تجربہ نہیں جیسا راجوں اور ان کے مخالفوں کو ہو سکتا ہے مگر حسن تو عورت کے خاوند کا ہی حصّہ ہوتا ہے۔
راجہ نل : یہ حصہ کم وبیش بھی تو ہوتا ہے۔
دمینتی : مگر اس طرح نہیں جس طرح حکومت۔ غریب گھر کی عورت بھی حسین ہو سکتی ہے۔ اور دولت مند گھرانے کی عورت بدصورت ہو سکتی ہے۔
راجہ نل : اس لیے دولت مندوں میں خوبصورتی اور بدصورتی کے سوال پر بگاڑ پڑ سکتا ہے۔
دمینتی : پشکر کو بدصورتی گوارا نہیں۔ وہ تو کسی حسین عورت سے شادی کرائے گا۔
راجہ نل : لیکن وہ تو سمجھتا ہے کہ اس دنیا میں تم سے زیادہ حسین کوئی عورت نہیں ہے۔
دمینتی : یہ تو اس کی بہت بڑی غلط فہمی ہے۔
راجہ نل : غلط فہمی بھی تو انسان کی فطرت ہے۔
دمینتی : ان سوالوں کا جواب ہمارے پاس نہیں۔ اس لیے ان کا ذکر بے معنی ہے۔
راجہ نل : لیکن دشمنوں سے پشکر کے مل جانے کے نتائج کو بے معنی کہہ کر نہیں ٹالا جا سکتا۔
دمینتی : ان نتائج کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہیے۔
راجہ نل : اسی سوال پر غور کرنے کے لیے تم سے یہ بات کی جا رہی ہے۔

(دروازے پر کوئی زور سے دستک دیتا ہے)

دمینتی : دربان اس طرح دروازہ کیوں توڑ رہا ہے؟
راجہ نل : کوئی بُری خبر لایا ہو گا۔ (بلند آواز سے) دربان ــــ آنے دو۔ (دمینتی سے) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی محافظ کوئی خبر لایا ہے۔
محافظ : (قریب آکر) مہاراج۔ حالات بہت بگڑ گئے ہیں۔ شہر کا زیادہ حصّہ ملبے کا ڈھیر بن چکا ہے۔ جھونپڑیاں اور محل لگاتار بارش کا شکار ہو چکے ہیں۔ باہر سے سیلاب شہر کی طرف دندناتا ہوا آ رہا ہے۔ لوگ منہدم مکانوں اور گرتے ہوئے گھروں

میں سے اپنی گٹھریاں لے کر بازاروں میں آ گئے ہیں۔ اُن بازاروں میں جو مسمار گھروں کے ملبے کے نیچے ابھی دبے نہیں ہیں۔ راج بھون کے سامنے بھاری ہجوم جمع ہو چکا ہے۔

(راجہ نل پریشان ہو کر خاموش رہتا ہے)

دمینتی: وہ راج بھون کے سامنے جمع ہو کر کیا کریں گے ؟ وہ فوج اور محافظوں کے ساتھ مل کر شہر کو بچانے کی کوشش کیوں نہیں کر رہے ہیں ؟

محافظ: بہت سے لوگ یہ کام بھی کر رہے ہیں مہاراج مگر ہر کسی میں اتنی ہمّت، اتنے حوصلے اور صبر و تحمل کا مادہ نہیں ہوتا۔

دمینتی: محنت مشقت کے سوا اس وقت کوئی اور مددگار بھی نہیں ہو سکتا۔

محافظ: کچھ لوگ اس کے اُلٹ بھی سمجھتے ہیں۔

دمینتی: ایسے لوگ پھر کیا کریں گے ؟

(محافظ خاموش رہتا ہے۔)

راجہ نل: کیا کریں گے ؟ وہ حکومت کے خلاف شور ہی مچائیں گے۔ وہ کہتے ہوں گے کہ ان مصائب سے بچانا حکومت کا فرض تھا۔

محافظ: ہاں مہاراج۔ اُن میں سے کچھ لوگ ایسا شور بھی مچا رہے ہیں۔

دمینتی: یہ تو بہت بُری بات ہے۔

راجہ نل: گرتے ہوئے مکان تلے دب جانے اور بھوکوں مر جانے سے تو یہ بُری بات نہیں۔

دمینتی: تو کیا ہم لوگوں کے مصائب کے واقعی ذمہ دار ہیں ؟

راجہ نل: بلا شک و شبہ پیاری ــ مگر ہمارے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں۔

دمینتی: جواب ہونا چاہیے تھا۔

راجہ نل: یہی بات وہ لوگ کہہ رہے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ یہ بات غصّے سے کہہ رہے ہیں اور تم صبر و سکون سے۔

دمینتی: تو پھر ؟

راجہ نل: راجہ یا کسی عظیم رہنما کی کسی بات سے ناراض ہو کر دیوتا غیظ آلود ہو جاتا ہے مگر مصیبت رعایا کو جھیلنی پڑتی ہے۔

دمینتی : رعایا بھی تو دیوتا کو غیظ آلود کر سکتی ہے۔

راجہ نل : ہو سکتا ہے مگر کم۔ رعایا بے قصور ہوتی ہے۔ زیادہ قصور راجہ یا رہنما کا ہوتا ہے۔

(دمینتی خاموش ہو جاتی ہے)

محافظ : صدر نے یہ گزارش کی ہے کہ محافظوں کے لیے آپ کا کیا حکم ہے ؟

راجہ نل : ہم رعایا کے سامنے آرہے ہیں۔

محافظ : تو پھر میں صدر کو بھیج دوں۔ انھوں نے یہ درخواست بھی کی تھی۔

دمینتی : ہاں صدر اور منتریوں کو بھیج دو۔

محافظ : مہاراج ــــ منتری تو اپنے اپنے بھون میں قیدی بنے بیٹھے ہیں۔ بارش کسی کو باہر ہی کب نکلنے دے رہی ہے۔

دمینتی : برکھا بھی قہر ڈھا رہی ہے۔ غریبوں کو گھروں سے باہر نکال رہی ہے۔ اور رئیسوں کو گھروں سے باہر نہیں آنے دے رہی ہے۔

محافظ : کچھ ایسی ہی بات ہے۔

راجہ نل : خیر جاؤ۔ صدر کو بھیج دو۔

(محافظ چلا جاتا ہے اور راج بھون کے کچھ حصّوں کے گرنے کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔)

دمینتی : (اٹھ کر راجہ نل کے گلے لگ جاتی ہے) مہاراج اب اور کوئی چارہ نہیں۔ آئیے بھون میں سے نکل چلیں۔ نہ جانے یہ بھی کب گر پڑے۔

راجہ نل : ہاں ــ شاید صدر یا کوئی اور اب ہم تک یہاں نہیں پہنچ سکتا۔

(راج بھون کے کروں کے گرنے کی کچھ اور آوازیں۔ بجلی کے چمکنے اور کڑکنے کی آواز۔)

دمینتی : مسمار کروں کے ملبے کے باعث شاید باہر کے دروازے تک جانے والا راستہ مسدود ہو گیا ہو۔

(بجلی رہ رہ کر کڑکتی ہے۔)

راجہ نل : (اُٹھ کر) اٹھو پیاری۔ بھون سے باہر نکل چلیں۔ باہر دالان میں کھلے آسمان کے نیچے کھڑے ہونے میں ہی خیریت ہے۔

دمینتی : (اُٹھتے ہوئے) ہاں ۔ آخر انسان کو اکیلے ہی ہونی سے ٹکرانا پڑتا ہے ۔

راجہ نل: اکیلے نہیں ۔ مرد اور عورت کو مل کر ۔

(بجلی کی کڑک سنائی دیتی ہے ۔ دونوں محل سے باہر کی طرف چل پڑتے ہیں ۔)

دمینتی : مرد عورت کے ملاپ سے ہی تو انسان بنتا ہے ۔

(نل اور دمینتی کے باہر نکلتے ہی راج بھون گرنے لگتا ہے — تھوڑی سی دیر میں وہاں ملبے کے سوا کچھ بھی باقی نہیں رہتا ۔ چاروں طرف اندھیرا چھا جاتا ہے ۔ آندھی کا زور بڑھ جاتا ہے ۔ بارش ہوتی ہے اور بڑے بڑے اولے بھی گرتے ہیں ۔ بجلی چمکتی ہے اور بادل گرجتے ہیں ۔)

پردہ

دوسرا منظر

صبح کے وقت راج بھون کا وہی مقام۔
آندھی۔ سیلاب اور طوفان تھم چکے ہیں۔ راج
بھون ایک مسمار ٹیلہ ہے — کھنڈر ہی کھنڈر۔
پانی میں جلے ہوئے پیڑ، چھپر اور چھتیں دکھائی دیتی
ہیں۔ شہر میں کسی طرح کی آبادی نظر نہیں آتی ہے۔
صرف ایک مرد، ایک عورت اور چند مہینے کا ایک
بچہ دکھائی دیتا ہے۔ یہ راجہ نل، رانی دمینتی اور
ان کا بیٹا ہے۔ ان کے بدن پر بہت کم کپڑے
ہیں۔

راجہ نل : جل، اگنی، پون — تینوں دیوتاؤں نے مل کر میرے نگر پر کیا کیا ظلم نہیں ڈھائے۔

دمینتی : جہاں پہلے یاتریوں اور سیاحوں کے لیے قابلِ دید محل، مندر اور بھون تھے اب وہاں ملبوں کے ڈھیر ہیں۔ اینٹوں اور پتھروں کے ڈھیر۔

راجہ نل : گلیاں، بازار اور راستے جن کو اینٹ پتھر کوٹ کر شیشے کی طرح صاف اور ہموار بنایا گیا تھا اب کہیں دکھائی نہیں دیتے۔

دمینتی : شفاف پانی کے رجبا ہے اور گندے پانی کی نالیاں مل کر ایک ہو گئے ہیں۔ ان کا بہاؤ بھی گری ہوئی اینٹوں اور پتھروں نے روک دیا ہے۔ چاروں طرف بدبو پھیلی ہوئی ہے۔

راجہ نل : دیوتاؤں نے اپنے مندر اور کلا بھون اور لوک سدن تباہ و برباد کر دیے ہیں۔

دمینتی : مجھے سب سے زیادہ رنج عام لوگوں کے مکانوں کے گرنے کا ہے۔ وہ بیچارے مصیبت اور ڈر کے مارے اس نگر کو چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔

راجہ نل : اور تو اور۔ چنڈالوں اور اچھوتوں کے جھونپڑے بھی دیوتاؤں کے عتاب سے نہیں بچے۔

دمینتی : دیہات میں بھی کون سا سکھ رہا ہوگا۔ وہاں بھی لوگ اُجڑ گئے ہوں گے۔
راجہ نل : دیہات کی حالت شہروں سے بھی بُری ہوگی۔
دمینتی : جانیں بھی بہت تلف ہوئی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ بدبو ملبے کے نیچے دبی ہوئی لاشوں کی ہو۔
راجہ نل : بھولی رانی۔ یہ بدبو کسی اور چیز کی ہو بھی کیسے سکتی ہے۔ میں تو اس ڈر سے تمہیں یہ نہیں بتا رہا تھا کہ کہیں تمہارا دل نہ دُکھے۔
دمینتی : کیا بہت سے لوگ مکانوں کے گرنے سے مر چکے ہیں ؟
راجہ نل : ہاں۔ بہت۔
دمینتی : سب کے سب ؟
راجہ نل : شاید سبھی مر گئے ہوں اور تھوڑے ہی بچ کر نکل پائے ہوں۔
دمینتی : (روتے ہوئے) ہم کیوں بچ رہے۔ ہم لوگوں کے بغیر کیا کریں گے ؟
راجہ نل : یہی تو ہم پر دیوتاؤں کا خاص کرم ہوا ہے۔ انھوں نے ہمیں اس لیے زندہ رکھا ہے تاکہ ہم ان کے غیظ و غضب کو محسوس کر سکیں۔
دمینتی : (روتے ہوئے) دیوتا ہم سے اتنا خفا کیوں ہو گئے۔ کیا بگاڑا ہے ہم نے ان کا ؟
راجہ نل : (اسے دائیں بازو کی گرفت میں لے کر) پیاری۔ تمہیں معلوم ہے کہ دیوتا ہم سے کیوں خفا ہیں۔ تم نے اُن سب کی محبت کو جو ٹھکرا دیا تھا۔
دمینتی : (اُسی لہجے میں) وہ سب مجھ سے محبت کرتے تھے اور مجھ سے شادی کرنا چاہتے تھے۔ میں کسے چنتی اور کس کو چھوڑتی۔
راجہ نل : انھوں نے تو کہا تھا کہ اگر تم ہم میں سے کسی ایک کو چُن لو تو دوسروں کو ملال نہیں ہوگا۔
دمینتی : (بھولے بھالے لہجے میں) آپ ان دیوتاؤں کے وعدے پر یقین کر سکتے ہیں لیکن میں نہیں۔ دوسرے بھی ناراض ہو کر یہی گل کھلاتے !
راجہ نل : مگر وہ مجھ سے تو خفا نہ ہوتے۔ میرے راج کو تو نہ اجاڑتے۔
دمینتی : پیارے میری محبت پا کر اور مجھے اپنی دُلہن بنا کر کیا آپ پچھتا رہے ہیں ؟
راجہ نل : نہیں پیاری۔ ہرگز نہیں۔ میں تو یوں ہی تمہارا دل ٹٹول رہا تھا۔

دمینتی : میں آپ کے سوا اور کسی کو بھلا چن سکتی تھی۔ دیوتا تو کیا بھگوان بھی ناراض ہو جاتا۔ تب بھی میں آپ ہی کو چنتی۔

راجہ نل : دمینتی۔ تم نے مجھے کیوں چنا ؟ کیا میں تمہیں دیوتاؤں سے بھی اچھا لگا ؟

دمینتی : ہاں ۔ آپ مجھے دیوتاؤں سے بہت زیادہ اچھے لگے۔

راجہ نل : پیاری۔ تم نے مجھ میں کیا خوبی دیکھی ؟

دمینتی : (سوچتے ہوئے) اس لیے کہ آپ انسان ہیں۔ میں دیوتاؤں کو چن کر کیا کرتی۔ میری زندگی کیسی ہوتی۔ میں انسان کی بیٹی ہوں ۔ دیوتا سے میرا کیا رشتہ ہو سکتا ہے

(محبت کے نشے میں نل سے لپٹ جاتی ہے۔)

راجہ نل : پیاری۔ تمہاری ان باتوں کو سن کر میں اپنے آپ کو دیوتاؤں سے بھی طاقتور سمجھ رہا ہوں ۔ اب مجھے اپنی خاطر اس ساری تباہی کا کوئی رنج نہیں رہا۔ ہاں جنتا کی خاطر مجھے بہت دکھ ہے۔

دمینتی : اب جنتا کا دکھ دور کرنے کے لیے ہمیں طاقت جمع کرنی چاہیے۔ سرگرم عمل ہو جانا چاہیے۔ لوگوں کی بحالی کے لیے کوشش کرنی چاہیے۔

راجہ نل : ہاں پیاری۔ اب ہمیں کسان بن کر اس زمین کو شاداب کرنا ہوگا اور اس میں بیج ڈال کر اس کو ثمردار بنانا ہوگا۔

دمینتی : تو پھر ہم کسان بنیں۔

راجہ نل : مگر یہ کام بہت دشوار ہے۔ مجھے تم پر اس سلسلے میں ترس آرہا ہے۔ تم راج محلوں میں پلی ہو۔ پھول سی نازک ہو۔ تم یہ دشوار کام کیسے کر سکو گی۔

دمینتی : پیارے ۔ عورت نرم و نازک ہوتی ہے تو پھر کیا ہوا۔ وہ دشواری اور مصیبت بھی تو شروع سے جھیلتی آئی ہے۔ میں اس راج کی بحالی کے لیے ساری مصیبت اور دشواری جھیلنے کے لیے تیار ہوں ۔

راجہ نل : تو پھر تم خود ہی بتاؤ کہ اس کام کو کیسے شروع کریں۔

دمینتی : میں پھاوڑا لے کر زمین تیار کروں گی۔ مٹی کے ساتھ مٹی ہو کر محنت کروں گی۔

راجہ نل : اور میں تمہارا ساتھ دوں گا۔

دمینتی : نہیں۔آپ بلبوں کے ان ڈھیروں میں سے گندم کا بیج ڈھونڈ کر لائیے میں زمین ہموار کر چکی ہوں گی۔ آپ تو نئے سرے سے ہل چلا کر گیہوں کی بوائی کر دیجیے گا —— بھگوان کی دیا سے ڈھیروں فصل اُگے گی۔

راجہ نل : پیاری۔ ہماری اس کڑی محنت کے دوران اس پھول سے بچے کی دیکھ بھال کون کرے گا ؟ کہیں بلکتا نہ رہے ——

دمینتی : نہیں پیارے —— اسی کے لیے تو سب کچھ ہو رہا ہے۔ اسی کے لیے تو سجالی کا کام ہو گا۔

راجہ نل: یہ تو ٹھیک ہے مگر.......

دمینتی : پیارے وسوسے چھوڑو۔ یہ بچّہ اگر پھول سا کومل ہے تو ہیرے جیسا سخت بھی ہے۔

راجہ نل: ہاں پیاری۔عورت ہو، مرد ہو، بچّہ ہو انسان سب کچھ کر سکتا ہے۔

دمینتی : ہاں —— اگر اس کے دل میں پیار ہو!

(لپک کر نل کے سینے سے لگ جاتی ہے)

پردہ

لوہار

بلونت گارگی

امرتا پریتم کے نام

ناٹک کھیلنے کے بارے میں

یہ ناٹک 1944ء میں لکھا گیا تھا۔ لاہور میں اسٹیج پر اسے پیش کرنے لیے اس کی ریہرسلیں ہوتی رہیں۔ ان ہی دنوں یہ ریڈیو پر نشر کیا گیا۔ بہت سے لوگوں نے اس کے مرکزی خیال کی مخالفت کی۔ قصور شہر سے لوہاروں کا ایک وفد ناراضگی کا اظہار کرنے کے لیے لاہور آیا ــــ وفد میں شامل لوگوں نے کہا ــــ "کیا لوہاروں کی عورتیں ایسی ہوتی ہیں؟ یہ لوہاروں کی ذات پر طنز ہے ــــ" ریڈیو پر یہ ناٹک کچھ برس کے لیے ممنوع قرار دیا گیا مگر اسٹیج پر اسے کامیابی اور ادبی طور پر مقبولیت حاصل ہوئی۔

مجھے جذبہ کے ظلم سے دلچسپی ہے۔ ناٹک "لوہار" میں جو کچھ بھی ظہور میں آتا ہے اس کا تعلق ایک لوہار کنبے سے نہیں بلکہ وہ سماج کے ٹوٹتے رشتوں اور جذباتی استبداد کی علامت ہے۔ یہ ذہنی اختلاف دوہری وفاداری اور جذبات کی سچائی کی عکاسی کرتا ہے۔

اس ناٹک میں میں نے ورثہ میں چلے آرہے جذبہ کو اُلٹا کر پیش کیا ہے۔ قدرتی طور پر بیٹی اپنی ماں کا ردِ عمل ہے۔ نئی پود میں پرانی نسل کے خلاف بغاوت کا جذبہ ہے۔ نئی بیداری پرانی بیداری کی کینچلی اتار کر پیشقدمی کرتی ہے لیکن میں نے اس ناٹک میں ذہنی بغاوت کی چنگاری ماں کی طرف سے بیٹی کی جانب نہیں پھینکی بلکہ بیٹی کی طرف سے ماں کی جانب پھینکی ہے۔ نسل در نسل چلی آنے والی عادات و خصائل کی رفتار کو میں نے الٹی طرف موڑ دیا ہے۔

ناٹک کی ہیروئن "سنتی" کے بارے میں کچھ لوگوں نے اعتراض کیا کہ ہندوستانی تہذیب میں رچی بسی عورت اس طرح کی شدید بغاوت نہیں کر سکتی لیکن دیہات میں ظلم،

قتل، اغوا، عداوتیں اور جنسی بغاوتیں عام ہیں۔ دیہاتی زندگی کو رومانی رنگ دے کر دکھینے کی ضرورت نہیں۔ نہ اُسے زمینی تنازعوں کا میدان کہنا چاہیے۔ اس کی بالائی پرسکون بودوباش اور گھروں کی پُرآسائش زندگی کے تلے جذبات کی آگ دہکتی ہے۔

ڈرامہ "لوہار" زندگی کی سنگدلی، بے رحمی اور آئے دن کے ظلم کی علامت ہے — لوہار کی بھٹی کرداروں کے نفسیاتی اعمال کے مطابق سلگتی، دہکتی اور جلتی ہے اور اسی اشاراتی عکاسی کا تقاضا کرتی ہے۔ ہتھوڑے کی چوٹ اس کے ہیرو کی سنگین فطرت میں شامل ہے۔ کرداروں کے عمل اور ان کے مکالموں میں سختی ہے جذباتیت نہیں۔ کہیں کہیں مکالمے شاعرانہ انداز میں تابندہ ہو جاتے ہیں جو کرداروں کی باطنی اور ذہنی کشمکش کو اجاگر کرنے کے لیے ہیں۔

سارا ناٹک ایک ہی مقام پر ظہور میں آتا ہے۔ لوہار کا اہرن اور دیگر ساز و سامان یوں محسوس ہوتے ہیں جیسے انھیں بے رحمی سے استعمال کیا گیا ہو۔ میں نے یہ ناٹک اسٹیج کے تجربے میں ڈھال کر اور اس پر چلا کر کے دوبارہ لکھا ہے۔

بلونت گارگی

کردار

کاکو ——— ایک لوہار
سنتی ——— اُس کی بیوی
بنو ——— اُس کی بیٹی
دیپا ——— اُس کا بیٹا
بچن ——— سنتی کی سہیلی
گجن ——— گاؤں کا ادھیڑ عمر کا جاٹ
پڑوسن
موچی
کھیٹک

پہلا ایکٹ

کاکو کا اہرن، دھونکنی، ہتھوڑا، سنسی اور دوسرے اوزار۔ ایک طرف چھکڑے کا پہیّہ دیوار کے ساتھ پڑا ہے۔
اسٹیج کے پیچھے ایک اَدھ کھُلی کھڑکی ہے جس میں سے رسوئی کا چولھا اور برتن دکھائی دے رہے ہیں۔ بائیں طرف ایک دروازہ گلی میں کھلتا ہے۔
سنتی بھٹّی کے گرد بکھرے ہوئے اوزاروں کو ترتیب دے رہی ہے۔ دیپا بھٹّی میں پھونکیں مار رہا ہے۔
بینو کندھے پر ایک پتیلا اٹھائے ہوئے رسوئی میں سے نکلتی ہے۔

سنتی : کہاں چلی ہو — پتیلا اُٹھائے ؟

بینو : دودھ دوہنے —

سنتی : اتنی جلدی — ؟ ابھی تو ڈھور ڈنگر باہر سے آئے ہیں۔ انھوں نے چارے میں منہ بھی نہیں مارا۔

بینو : گائے کو ابھی دودھ لاؤں ورنہ لیوا اکڑ جائے گا۔ میری باٹ دیکھ رہی ہوگی۔ اگر ذراسی دیر ہو جائے تو سینگوں پر اُٹھانے دوڑتی ہے۔

سنتی : ابھی تو دن بھی نہیں ڈھلا۔

بینو : دن ڈھلے جاؤں تو تم بگڑتی ہو کہ بے وقت کیوں گھومتی پھرتی ہے۔ کہتی ہو کہ لوگ باتیں بناتے ہیں۔

سنتی : جاؤ پھر۔ گھر وہیں نہ بیٹھی رہنا۔ باڑے میں دودھ کا چھینٹا دینا مت بھولنا۔ ورنہ گگّا پیر روٹھ جائے گا۔ چوماسے کے دن ہیں۔ دیا جلا کر رکھ آنا اور جلدی آنا۔

دیپا : میں جاؤں اس کے ساتھ دھار نکالنے ؟

بینو : تم بھٹّی پر بیٹھو اور یہاں کا کام کرو۔

سنتی : تو کہاں چل دیا! ابھی تیرا "باپو" آنے والا ہے۔

دیپا : ابھی تو دن ہے۔ گلی میں میرے ہجولی کھیلتے ہوئے سنائی دے رہے ہیں۔ باپو کے آنے سے پہلے لوٹ آؤں گا۔

سنتی : لے وہ تو آ گیا۔

بینو : یہ باپو نہیں۔

سنتی : کون ہے؟

(گجن داخل ہوتا ہے)

گجن : ذرا آگ لینے آیا تھا۔ چلم کے لیے بس ایک کوئلہ چاہیے۔

سنتی : ابھی بھٹی دہک نہیں رہی ہے۔

گجن : مجھے تو بس ایک ہی انگارہ چاہیے۔ اس سے چلم سلگنے لگے گی۔

بینو : جلدی جاؤں۔ گائے رمبھانے لگی ہے۔ (جاتی ہے)

سنتی : اپنے پڑوسیوں سے آگ لے لیتے یا جھیوروں کی بھٹی سے ——

دیپا : تمہیں تھوڑی سی آگ نکال کر دوں۔

سنتی : دبکی ہوئی آگ نہ چھیڑنا۔

گجن : کاکو کہاں ہے؟

سنتی : گاؤں کے پروہت کے پاس گیا ہے۔ بینو کی شادی کا دن مقرر کرنے۔

گجن : کیا کوئی لڑکا ڈھونڈ لیا ہے؟

سنتی : ہاں۔ "موڑاں والے" لوہاروں کا بیٹا۔

گجن : اچھا کیا۔ اب تو وہ جوان ہو گئی ہے اور شادی کے قابل ہے۔ اور مجھے دیکھ جب عمر تھی تو شادی نہ کرائی۔ وقت ہاتھ سے جاتا رہا۔

سنتی : تو مور کھ رہا۔ اچھے اچھے گھروں سے رشتے آئے۔ خربوزوں جیسی لڑکیاں مگر تو نے حامی نہ بھری —— نہ جانے تیری نظر میں کیا تھا۔

گجن : مجھے کوئی غم نہیں۔ خانہ داری میں الجھ کر صرف گھر کا ہو کر رہ جاتا۔ اب مزے میں ہوں۔

سنتی : ہاں۔ اب تو روٹی سینکنے کے لیے خود چولھا پھونکنا پڑتا ہے۔ بیوی ہوتی تو پکی پکائی ملتی۔ چولھا جلتا تو گھر میں سکھ ہوتا۔ چلم اٹھائے ایک انگارے کے لیے دربدر نہ

گھومتا۔

گجّن : سنتی — تو ایک انگارے کے لیے سو باتیں بناتی ہے۔ آخر انھیں جل کر راکھ ہو جانا ہے۔ پرسوں تو نے بھٹی میں سے راکھ نکال کر پھینکی تو اس میں بہت سے کوئلے دہک رہے تھے۔

سنتی : چلم آگے بڑھا اور یہ لے کوئلے۔ اب چلتا نظر آ۔

(کاکو آتا ہے)

سنتی : اتنی دیر کہاں رہا۔ لوہے کے دس ڈلے پڑے ہیں کوٹنے کو.....

کاکو : "موڑاں" سے بنتو کا سسر آیا ہوا تھا۔ ہم نے مہورت نکلوالیا ہے۔ اسوج کا نکلا ہے۔ پروہت کے یہاں دیر ہو گئی۔ ساونی کی بوائی کے بعد کام کا زور کم ہو جائے گا۔ بچی کو شادی کر دیں گے۔

گجّن : سمے بیتتے کیا دیر لگتی ہے۔ ابھی کل کی بات ہے۔ آنگن میں گڈا گڑیا کھیلتی تھی۔ دنوں میں کتنی بڑی ہو گئی ہے۔

کاکو : ہاں — بنتو کے بیاہ پر برات تین دن ٹھہرائیں گے۔ تین دن تک سمدھیوں کی خوب خاطر تواضع کر کے انھیں اس طرح شاد کر کے بھیجوں گا کہ گاؤں والے یاد رکھیں گے۔

سنتی : یوں ہی نہ شیخی بگھار۔ جس نے بیٹی دیدی اُس نے سب کچھ دے دیا۔

گجّن : میں بنتو کو ریشمی جوڑا لے کر دوں گا۔

کاکو : تیرا ہل پرسوں تیار ہو جائے گا۔ آنا اور لے جانا۔ میں دن بھر گھر پر ہی رہوں گا۔

گجّن : چلم کے دو کش لگا کے رگوں میں جان پڑ گئی۔ (جاتا ہے)

کاکو : دیپے ! ذرا ہمّت سے پھونک مارو۔

(اہرن پر بیٹھ جاتا ہے)

سنتی : پہلے روٹی کھالے پھر کام کرنا۔ صبح سے کچھ بھی نہیں کھایا۔ روٹی ٹھنڈی ہو جائے گی۔

کاکو : لوہا ٹھنڈا ہو جائے تو وہ بھی بُرا۔ اس وقت آہنی ڈلے سُرخ ہو رہے ہیں۔ ان کو پٹنا چاہیے۔

(سنتی اندر جاتی ہے)

دیپے ! اس ڈلے کو پانی میں ڈبو لا — میں نے اس کا پتہ مار دیا ہے..... کہاں ہے

میری چھینی ؟

دیپا : مجھے خبر نہیں ——

کاکو : چھینی کہاں ہے بینو کی ماں ؟

سنتی : (اندر سے جھانکتے ہوئے) یہیں کہیں رکھی ہو گی بینو نے۔

کاکو : وہ چھینی سے کیا کر رہی تھی ؟

سنتی : یہیں کہیں ہو گی۔

کاکو : تو ڈھونڈ دے۔

سنتی : وہی آ کر ڈھونڈ دے گی۔

کاکو : کہاں ہے وہ ؟

سنتی : باڑے میں گائے دوہنے گئی ہے ——

کاکو : اکیلی ہی ؟

سنتی : ہاں

کاکو : تجھے اتنی بار سمجھایا ہے کہ اسے باڑے میں اکیلی گائے دوہنے کے لیے نہ بھیجا کر لیکن تو........

سنتی : ابھی آئی جاتی ہے۔

کاکو : تو خود کیوں نہ گئی ؟

سنتی : میں اکیلی کیا کیا کروں —— جوہر پہ کپڑے دھونے گئی، برتن صاف کیے، روٹیاں پکائیں۔ بھٹی دہکائی ——

کاکو : روٹیاں بعد میں لگا لیتی —— ! اس سے کہتی وہ پکا لیتی۔ اسے گئے ہوئے کتنی دیر ہوئی ہے ؟

دیپا : ایک گھنٹہ ہو گیا ہے۔ اسے گئے ہوئے دیر ہو چکی ہے۔ میں جاؤں ؟

کاکو : جا اور اُسے بُلا لا۔

(دیپا دوڑ جاتا ہے)

اب وہ کمسن نہیں۔ جوان ہو گئی ہے۔ اس کی نگرانی کیا کر....

سنتی : وہ جاتی کہاں ہے۔ بس گھر کا کام کرتی ہے۔

کاکو : ہاں۔ ہاں — گھر کا کام گھر میں بیٹھ کر کیا کرے۔

سنتی : میں آٹا گوندھ رہی تھی — گائے دوہنے کون جاتا۔ یہ مرکھنی گائے کسی اور کو نزدیک بھی تو نہیں پھٹکنے دیتی۔ اُس دن دودھ دوہنے گئی تو اس نے لات ماری۔ میری چھاتی میں ابھی تک درد ہو رہا ہے۔ وہ بنیو کے ہتھے چڑھی ہوئی ہے۔ وہ ہی اُسے دوہ سکتی ہے۔

کاکو : اس دن کی بات یاد ہے —! باڑے میں صوبیدار کے سرون کے ساتھ باتیں کرتی ہوئی پکڑی گئی تھی۔ دیئے جل اُٹھے تھے۔ اپنی پڑوسن نائن نے دیکھا کہ بنیو سرون کے منہ میں گائے کے دودھ کی دھاریں مار رہی تھی۔ بات سارے گاؤں میں پھیل گئی۔

سنتی : لوگوں کی زبان کون روک سکتا ہے۔ اس گاؤں کی عورتیں رائی کا پہاڑ بناتی ہیں۔ میں اپنی بیٹی کو جانتی ہوں۔ اس میں کوئی عیب نہیں۔

کاکو : تیری تو عقل ٹھکانے نہیں۔ بڑی مشکل سے اس کے لیے بَر ڈھونڈا ہے۔ کوئی گھوڑی مانگتا تھا کوئی بیلوں کی جوڑی۔ یہ تو اس کے کرم اچھے تھے کہ "موڑاں" والوں نے اس کا رشتہ قبول کر لیا۔

سنتی : لڑکا دیکھا بھی ہے کہ سنی سنائی پر اینٹھ رہے ہو ؟

کاکو : میں خود دیکھ کر آیا ہوں۔ سارے گاؤں میں اس کا لوہار کا کام اوّل درجہ کا ہے۔ لڑکا صحت مند اور جوان ہے۔ پندرہ پندرہ گھنٹے کام کرتا ہوا نہیں تھکتا، جیسے لوہے کا بنا ہوا ہو۔

سنتی : فتو کمہارن کہہ رہی تھی کہ کالا بھجنگ ہے۔

کاکو : ہونہہ! تو پھر تحصیلدار کہاں سے لے آؤں — اری یہ تو نکھٹو اور بیکاروں کی باتیں ہیں۔ ہاتھ پاؤں ہلانا نہیں۔ بدن پیلا ہی تو ہو گا۔ اچھا تو آئندہ یاد رکھنا۔ اُسے رات کو باڑے میں نہ بھیجنا۔ جو اس کے سسرال میں اس بات کی بھنک بھی پڑ گئی تو وہ رشتہ چھوڑ دیں گے۔

سنتی : تمہیں تو جب سوجھتی ہے اُلٹی ہی سوجھتی ہے۔ میں نے اس دن پوچھا تو اس نے گائے پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی تھی۔

کاکو : جاکر دیکھتا ہوں کہ وہ وہاں کیا کر رہی ہے۔اتنی دیر ہوگئی ہے۔نظام منّے کا گھوڑا دو پھیرے لگاکر آگیا ہے۔سو دھاں بکری چراکر واپس آگئی ہے ــــ تنور سے سب عورتیں روٹیاں پکاکر جاچکی ہیں۔وہ ابھی تک نہیں لوٹی۔

(دیپا دوڑتا ہوا آتا ہے)

دیپا : باپو!

کاکو : کیا ہے۔

دیپا : بینو باڑے میں نہیں تھی۔

کاکو : اچھی طرح دیکھا بھی تھا ــــ؟

دیپا : ہاں۔سارا باڑہ ــــ ناند پہ پتیلا پڑا تھا اور وہ وہاں نہیں تھی۔

کاکو : نامراد اولاد! گھر کی عزّت پر کلنک ــــ تو یہاں بیٹھ۔جاتا ہوں اور اسے لاتا ہوں۔

(بینو دودھ کا پتیلا اٹھائے ہوئے آتی ہے اور اندر جانے لگتی ہے)

کاکو : بینو!

بینو : کیا؟

کاکو : تو کہاں گئی تھی؟

بینو : گائے دوہنے۔

کاکو : تو باڑے میں نہیں تھی۔

بینو : میں وہیں تھی۔دودھ کا "دوہنا" دیکھ لو ــ ابھی تو جھاگ بھی نہیں بیٹھی۔

کاکو : میں جانتا ہوں تیری چترائی کو۔

بینو : میں باڑے میں ہی تھی۔کھونٹے سے بچھڑا کھولا تو اس نے گائے کے سر مارا اور گائے کو "پا" لیا اور دودھ پینے لگا۔میں نے رسی باندھ کر تھن دھوئے بچھڑے کو دھکیل کر کھونٹے سے باندھ دیا اور دودھ دوہنے بیٹھ گئی۔

کاکو : تیرے پیچھے دیپے کو بھیجا تھا ــــ تو وہاں نہیں تھی۔

بینو : مجھے معلوم نہیں تھا کہ دودھ دیتے ہوئے اگر ذرا دیر ہوگئی تو گھر میں بھگدڑ مچ جائے گی۔ میرے پیچھے لڑکا دوڑا دیا جیسے میں کوئی چور ہوں۔

دیپا : میں نے اسے سب جگہ ڈھونڈا

بینو : بکو مت،

کاکو : دیپے۔ دوڑ کر ڈاک بنگلے جا اور ڈپٹی کے چپڑاسی سے جا کر کہہ کہ وہ گھوڑا یہاں لے آئے۔ دو سندیسے آ چکے ہیں صبح سے — جا۔

(دیپا دوڑتا ہوا جاتا ہے)

مجھے معلوم ہے کہ تو کہاں گئی تھی۔ دیوار پھاند کر کیا اسی مشٹنڈے سے ملنے گئی تھی؟

بینو : باپو۔

کاکو : کم ذات کہیں کی۔ میں سب جانتا ہوں۔ کسی نہ کسی بہانے باہر کھسکی رہتی ہے۔ کبھی سوت کاتنے، کبھی "گدّا" رچانے، کبھی جوہڑ پر کپڑے دھونے۔ تجھے تو کوئی نہ کوئی بہانہ چاہیے۔ تو اُس بدمعاش سے ملنے سے باز نہیں آتی۔

بینو : تمہیں تو گاؤں کا ہر جوان لڑکا بدمعاش نظر آتا ہے۔

کاکو : سرون تو چھٹا ہوا ہے۔

بینو : تمہیں تہمت لگاتے ہوئے شرم نہیں آتی؟ ہر وقت شک، ہر وقت آنکھوں میں خون۔

کاکو : تو یہ فضیحتہ نہیں چھوڑے گی؟ تجھے اتنی بار منع کیا ہے۔

(بینو اندر جانے لگتی ہے)

کاکو : کہاں جا رہی ہے؟

بینو : چھوڑ دو مجھے۔

کاکو : کل سے دودھ دوہنے گئی تو ٹانگیں توڑ دوں گا۔

بینو : چھوڑ دو۔

کاکو : تیری یہ حرکتیں کسی دن ہمیں لے ڈوبیں گی۔ آخری عمر میں تو میری داڑھی میں خاک ہی ڈالے گی۔ اور نہیں تو کیا — اِدھر میں نے اس کے لیے جو بر تلاش کیا ہے۔ اس لڑکے کا لوہار کا کام خوب چمکا ہوا ہے۔

بینو : ہاں — لوہار کا کام — اسی لیے تو مجھے اس سے نفرت ہے۔

کاکو : تیری عقل ٹھکانے ہے یا نہیں؟

بینو : نہیں۔

کاکو : کیا کہا؟

بینو : نہیں۔ میری عقل ٹھکانے نہیں۔ میں آئے دن کا یہ جھوٹ ختم کر دوں گی۔
کاکو : کون جھوٹ بولتا ہے ؟
بینو : میں نے۔
کاکو : کیا ؟
بینو : میں نے جھوٹ بولا تھا ــــ میں اُسے چھپاتی رہی۔ لیکن آج اس کا فیصلہ کر کے رہوں گی ــــ ہاں میں اس سے ملنے گئی تھی۔
کاکو : تو میری بیٹی نہیں ہے ــــ کس بے ایمان کی اولاد ہے۔ دیکھتی کیا ہے سنتی نہیں ؟
بینو : نہیں۔
کاکو : کیا ــــ !
بینو : میں نے کچھ نہیں سُنا میرا گلا گھونٹ دو۔ مجھے قتل کر دو۔ مجھے اس گھر سے نفرت ہے۔ اس بھٹی سے ــ تم سے۔
کاکو : تو یہ لچھن چھوڑ دے۔ اس طرح ......
بینو : ہاں۔ اس طرح .... میں نہیں رہوں گی نہیں۔ نہیں۔ سو بار نہیں۔
کاکو : (اس کا بازو مروڑتے ہوئے) ملے گی اُس سے ؟ ملے گی ؟ ملے گی ؟
بینو : (آنسو بہاتے ہوئے) نہیں نہیں ... چھوڑ دو .... نہیں ..... چھوڑ دو۔
کاکو : گھر سے باہر قدم رکھا تو ٹکڑے کر دوں گا۔

(سنتی دوڑتی ہوئی آتی ہے)

سنتی : لڑکی سے کیوں کشتی لڑ رہے ہو ؟ چھوڑ و میری بیٹی کو۔
کاکو : جب میں اسے اپنے سامنے بولتے ہوئے دیکھتا ہوں تو میرے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ لے جا اسے اندر۔

(بینو اندر جاتی ہے)

سنتی : آگ بگولا کیوں ہو رہے ہو۔ جوان بیٹی پر ہاتھ اٹھاتے ہوئے ساری دنیا دیکھتی ہے۔
کاکو : دیکھنے دے۔ میں کسی سے نہیں ڈرتا۔ میں گاؤں میں گردن جھکا کر نہیں چلوں گا۔ میں اس کے سارے بل نکال دوں گا۔ اس نے ابھی میرا غصہ دیکھا نہیں۔ کیا مجال جو زبان ہلا سکے ــ تو نے اسے سر چڑھا رکھا ہے۔ تو اس کی حمایت کرتی ہے ــــ دو کس ہے۔

کیا ہوا؟ کپڑے دھونے چلی گئی تو کیا ہوا۔ باڑے میں گائے دوہنے چلی گئی تو کیا ہوا"۔
اب دیکھ رہی ہو اس "کیا ہوا" کو ——

سنتی : تم نے اس پر ہاتھ اُٹھایا تبھی جواب دیتی ہے۔ اس دن تم نے تھپّڑ مارا۔ تمہاری پانچوں اُنگلیاں اس کے گال پہ نقش ہو گئیں۔ جوان بیٹے بیٹی کو گھر کے اندر سمجھایا کرتے ہیں۔

کاکو : وہ سمجھے بھی۔ اگر میری بیٹی ہوتی تو اس کی کیا مجال جو کسی کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھتی۔

سنتی : وہ تمہاری بیٹی ہے۔ اسی لیے ضدّی ہے۔

کاکو : وہ تجھ پر گئی ہے —— اچھی بھلی تھی —— گھر کا کام کرتی تھی —— شرماتی بھی تھی۔ لیکن اس نے تو ایک دم ساری شرم اتار پھینکی —— اس گھر میں تو کسی کو ڈانٹنا ہی جرم ہے۔ نامراد اولاد ہے۔ کوئی بھی بات ٹھیک نہیں۔ کوئی چلن ٹھیک نہیں۔ ٹھیک ہو تو کیسے ہو —— تو کون سی ٹھیک تھی۔ اس گھر میں آنے کے بعد تو نے سال بھر تک مجھ سے بات نہیں کی تھی۔

سنتی : پُرانی باتیں کیوں چھیڑ رہے ہو۔ وہ باتیں ختم ہوئیں۔ بھٹی کی راکھ میں سب کچھ دفن ہو گیا۔ میں تو سب کچھ بھُلا چکی ہوں۔

کاکو : تجھے پانچ سال لگے تھے ...... شاید سات سال۔ تب کہیں جا کر تو نے مجھ سے سیدھے منہ بات کی تھی۔ پتہ نہیں چلتا تھا کہ تجھے دکھ کیا تھا۔ میں نے تیری ہر طرح سے خاطر مدارات کی لیکن تو سدا اپنے میکے والوں کی سگی رہی۔ جب میں تجھ سے یہ کہتا کوئی بات کر دو تو تو خاموش رہتی ...... کسی نے جیسے ایک پتلے پر جادو ٹونا کر دیا ہو۔ تو اس گھر میں بیگانوں کی طرح رہی۔

سنتی : جب بھی تم مجھے اُن دِنوں کے طعنے دیتے ہو میرا کلیجہ جلنے لگتا ہے۔ میں نے یہاں آ کر اپنی قسمت کے آگے سر جھکا دیا۔ اور صبر کا گھونٹ بھر کر اسی بھٹی کی ہو کر رہ گئی —— اب مطمئن ہوں۔ میں نے تم سے کبھی کوئی شکایت نہیں کی۔

کاکو : تو اپنا میکہ ابھی تک نہیں بھولی۔ عورتوں کو یہ مار ہوتی ہے۔ میکے میں سوکھے ٹکڑے کھائیں گی، چیتھڑے پہنیں گی پھر بھی میکے کی تعریف کریں گی۔

سنتی : تم میرے میکے پر کیچڑ نہ اچھالو۔

کاکو : خبر نہیں۔ وہاں کیا تھا... کوئی پوشیدہ مرض۔ کوئی خفیہ بات۔ کوئی خونی کرتوت...

سنتی : میں اس گھر میں تمہاری بن کر رہی ہوں — دن رات کام میں مصروف رہی ہوں۔

کاکو : کیا کام سے اکتا گئی ہے ؟

سنتی : سردیوں کی لمبی راتوں میں بھٹّی کے آگے بیٹھی کیا تمہاری بنڈی نہیں سیتی رہی ؟ تمہارے پھٹے پرانے تہمد کاٹ کر دیپے کے کُرتے نہیں بناتی رہی ؟ کیا خود روئی دھنک کر رضائیاں نہیں بناتی رہی ؟ میں کام سے جی نہیں چراتی۔ کام نے تو میرے منتشر خیالوں کو یکجا کر دیا۔ میں نے تمہیں خوش رکھنے اور گھر کی عزّت کو بچانے کے سبھی جتن کیے۔ میں نے تمہارے لیے بیٹے کو جنم دیا۔ بیٹی کو جنم دیا۔ لیکن تم نے دل میں بیر رکھا۔ دل میں شک کی پرورش کی۔ مجھے ایک دن کے لیے بھی کہیں جانے نہ دیا — مجھے بھٹّی سے باندھے رکھا۔ ایک بار میں نے اپنا میکہ چھوڑا۔ دوبارہ وہاں جانا نہ ہوا۔

کاکو : تجھے میکے جانے سے کب روکا ؟

سنتی : اب میں وہاں کس کے پاس جاؤں۔ کون ہے میرا۔ ماں تھی، وہ رو رو کر مر گئی۔ سہیلیاں تھیں — ان سب کا بیاہ ہو گیا۔ نہ کوئی بہن، نہ کوئی بھائی۔ ماں کے مرنے کے بعد میرا وہاں جانے کو جی نہ چاہا۔ میرا باپ بھی ایک ظالم لوہار تھا۔ ضدی۔ اکھڑ۔ رشتہ داروں سے بیر رکھنے والا اور خبطی۔ عمر بھر میری ماں کو ستاتا رہا۔ جھنجھوڑتا رہا۔ لوگ تو یہ جانتے ہیں کہ وہ سانپ کے ڈسنے سے مری تھی لیکن اس کی موت کی اصل وجہ میرا باپ تھا۔

کاکو : نہیں۔ تیرا باپ اس دن منڈی گیا ہوا تھا۔ کچہری میں گواہی دینے۔ وہ وہاں نہیں تھا۔

سنتی : وہ گھر میں نہیں تھا۔ ہمارے آنگن میں ایک نیم کا پیڑ تھا جس پر میں جھولا جھولتی تھی۔ اسی جھولے کی رسی سے میری ماں نے گلے میں پھندہ ڈال لیا۔ اور کر تی بھی کیا۔ میرے باپ کے لوہے جیسے کردار اور ظلم نے اس کے اندر کی عورت کو پہلے ہی مار ڈالا تھا۔

کاکو : کیوں اپنے باپ کی قبر کھود رہی ہے۔ تجھے اُس نے پالا پوسا۔ بیاہا۔ اور اب وہ

اس دنیا میں نہیں ہے۔

سلتی : میرے باپ نے میری شادی تم سے کر کے اپنی ضد پوری کی — وہی ریت نباہی لوہاروں والی دہکتی ہوئی عداوت۔ بھٹی کا سراپ۔ میں ایک بھٹی سے دوسری بھٹی کی راکھ کھنگالنے کے لیے یہاں آگئی۔ مجھے تپے ہوئے لوہے کی بُو اور دھوئیں، اور دھونکنی کی بھڑاس سے نفرت تھی۔ میرا دل کھلے کھیتوں، ساون کے جھولوں اور پانی سے لبالب نہروں کے لیے ترستا تھا لیکن تمہارے گھر آکر یہ سب کچھ مٹ گیا۔ تمہارے سخت سبھاؤ نے ہر چیز پیس کر رکھ دی۔ اب اگر تمہاری بیٹی یا تمہارا بیٹا تمہارے سامنے بولتا ہے ......

کاکو : بیٹے کی کیا مجال۔ صرف بیٹی نے ہی قیامت اٹھا رکھی ہے۔ تو ہر ایک بات دل سے لگا لیتی ہے۔ ڈانٹا بینو کا تھا لیکن بات تو نے اپنے اوپر لے لی۔

(دیپا دوڑتا ہوا آتا ہے)

دیپا : باپو۔ چپڑاسی گھوڑا لے آیا ہے۔

کاکو : دھونکنی پر بیٹھ۔ میں ذرا نعل گرم کر لوں۔ (پکارتا ہے) گھوڑے کو کھونٹے سے باندھ دو۔ ابھی آیا۔ دو آدمی اور بلا لو جو گھوڑے کو قابو میں رکھ سکیں۔

(وہ اہرن پر نعل رکھ کر پیٹنے لگتا ہے۔ باہر سے گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز آتی ہے)

پردہ

دوسرا ایکٹ

ایک ہفتہ بعد ــــ
سنتی بھٹی کے پاس بیٹھی ہے ۔ بنیو ناظرین کی طرف پیٹھ کیے دور کھڑی ہے ــــ وہ غصے سے ماں کی طرف دیکھتی ہے اور اسٹیج کے آگے آکھڑی ہوتی ہے ۔

سنتی : چپ کیوں ہوگئی ۔ بول ۔

بنیو : میرا بازو ابھی تک دکھ رہا ہے ۔ اس نے مجھے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹا اور مارا ــــ میری کہنیاں رگڑی گئیں ۔

سنتی : تو بھی تو اپنی ضد سے باز نہیں آتی ۔ اس کے سامنے کیوں بولی ۔ ذرا عقل سے کام لیا کر ۔ تجھے جنم دیا ۔ تیری پرورش کی .....

بنیو : تو پھر میرا گلا گھونٹ دو ۔

سنتی : پھر اُس سے ملی تھی ؟

بنیو : کس سے ؟

سنتی : سردن سے .....

بنیو : بار بار کیوں پوچھتی ہو ۔

سنتی : اس کے جھانسوں میں نہ آجانا بیٹی ۔

بنیو : مجھے اس نے کوئی جھانسہ نہیں دیا ۔

سنتی : کیا کہتا تھا ۔

بنیو : کچھ بھی نہیں ۔

سنتی : تو ابھی الھڑ ہے ۔ تو کچھ نہیں جانتی ۔

بنیو : مجھے بہت پتہ ہے ۔

سنتی : مجھے معلوم ہے جبھی تو میں تجھے سمجھا رہی ہوں ــــ دکھ اُٹھاؤگی ــــ

بنیو : تم نے بہت سُکھ پائے ہیں ۔

سنتی : بینو !

بینو : تو پھر تم مجھ سے کیا کہہ رہی ہو۔ میری زندگی تو لوہے اور بھٹی کے دھوئیں میں ... میرا تو ان چیزوں میں دم گھٹتا ہے ـــــ میں اس گھر نہیں جاؤں گی جس میں سے باپو کی بھٹی کی بُو آتی ہو گی۔

سنتی : میں بھی تو رہی ہوں ـــ پورے اٹھارہ برس ـــــ تو میری طرف دیکھ !

بینو : تمہیں دیکھ کر ہی تو مجھے ڈر لگتا ہے۔

سنتی : اس نے تجھ پر کیا جادو کر دیا ہے ـــــ ؟

بینو : ماں ـــ یہ نہ کہہ۔

سنتی : تو یہ روش چھوڑے گی کہ نہیں ؟

بینو : کون سی روش ـــ ؟

سنتی : مجھے معلوم ہے کہ سارے گاؤں میں کیا اڑی ہوئی ہے۔

بینو : خاک !

سنتی : تو خاک ہی اڑائے گی ـــ دھول اور راکھ ! یہ تیری عقل کو کیا ہو گیا ہے ـــ ؟

بینو : کچھ بھی نہیں۔

سنتی : تو میری سنتی کیوں نہیں ہے۔

بینو : تم میری کیوں نہیں سنتی ہو۔

سنتی : اگر میری اپنی اولاد ہی میری بیرن ہو جائے تو میں کیا کروں ـــ تو نے سب کی شرم وحیا کیوں خاک میں ملا دی ہے۔ بیٹیاں سو پردے رکھتی ہیں۔ ماں اپنی بیٹی کے بارے میں سب کچھ جانتی ہے۔ اُس کے بھید۔ اس کی شرم۔ تو مجھے سب کچھ بتاتی رہی مگر سرون کے بارے میں کوئی بات نہ کی۔

بینو : میں یہ کسی کو بھی نہیں بتا سکتی تھی۔ یہ میرے من کا بھید تھا۔ گہرا راز ـــــ میں تمہیں اُس میں شریک نہیں کر سکتی تھی۔ ایک بار ہم جوہڑ پر کھیل رہے تھے۔ میں پیپل پر جا چڑھی۔ ٹہنی ٹوٹ گئی اور میں جوہڑ میں جا گری۔ اُس نے میرے پیچھے ہی چھلانگ لگائی اور وہ مجھے بازو سے پکڑ کر تیرتا ہوا جوہڑ سے باہر نکال لایا ـــ اس وقت میں بارہ برس کی تھی۔ میں نے اس کے بازو کی طاقت محسوس کی، کسی کو بچانے کی تڑپ

محسوس کی کسی کے لیے جان نچھاور کر دینے کی دلیری کو پہچانا — میں اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتی تھی۔ میں کڑکتی دوپہر میں جوہڑ پر کپڑے دھونے جایا کرتی تھی۔ — پھر ایک دن — تم نے مجھے وہاں جانے سے روک دیا۔ میرے کلیجے میں الاؤ دہکنے لگا۔ میں سرون سے ملنے کے لیے تڑپنے لگی۔ ایک دن جب میں گائے کا دودھ دوہ رہی تھی۔ سرون باڑے کی دیوار پھاند کر اندر آ گیا۔ بس یہ بات سارے گاؤں میں پھیل گئی۔ تم میری کڑی نگرانی کرنے لگیں اور باپو ظالم رکھوالا بن گیا۔

سنتی : میں تیری بدی اپنے سینے میں چھپائے ہوئے ہوں —

بینو : کون سی بدی ؟

سنتی : میں تیرے باپو کا غصّہ جھیلتی ہوں — جب وہ تجھ پر برس رہا ہوتا ہے تو وہ اصل میں اپنا غصّہ مجھ پر نکال رہا ہوتا ہے۔

بینو : تم اپنی بدی کا مجھے قصوروار نہ ٹھہراؤ۔ باپو کی تم سے پُرانی دشمنی ہے۔ اس نے تمہیں کبھی معاف نہیں کیا اور کرے گا بھی نہیں۔ تم دونوں نے اس گھر کی عزّت اور احترام کا ڈھونگ رچا رکھا ہے۔ خالص دکھاوا — خالص جھوٹ !

سنتی : تیرا مطلب کیا ہے ؟

بینو : میری آنکھوں پر پٹی نہیں بندھی ہوئی ہے۔ تمہیں بھی تو وہ ملنے آتا ہے۔

سنتی : کون ؟

بینو : کل بھی وہ آیا تھا۔ آگ لینے کے بہانے —

سنتی : میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔

بینو : تم یہی کہتی ہو۔ لیکن اس نے اس گھر کی ہر چیز سے تعلق قائم رکھا ہے تاکہ اس کا تعلق تم سے قائم رہے۔

سنتی : ہوش کے ناخن لے لڑکی۔

بینو : گاؤں کی نائن جب میرے بال گوندھنے آئی تو اس نے دھیرے دھیرے میرے کانوں میں تمہارے بھید کھولے اور اس کے بھی جو یہاں آگ لینے آتا ہے۔ ایک عرصہ سے وہ تمہاری ٹوہ لیتا رہا ہے۔ ایک بار رات کو باپو نے تم سے جھگڑا کیا۔ اور اس نے ہتھوڑا اٹھا لیا مگر تم اس کے پاؤں پر گر کر رونے لگیں — میں اس وقت پانچ

برس کی تھی۔ دالان میں سوئی پڑی تھی۔ میں نے سب باتیں سنیں اور اندھیرے میں ہو رہی یہ جنگ دیکھی۔ آہستہ آہستہ تم پرانے جذبات کو دبا کر لوک لاج ماننے لگیں۔ مگر وہ مرد اب بھی تمہارے سوئے ہوئے دل میں بسا ہوا ہے ــــــ

سنتی : تو مجھ سے کس بات کے بدلے لے رہی ہے ــــ؟

بینو : بدلہ تم نے لیا ہے مجھ سے، مجھے جنم دے کر۔

سنتی : تو لوگوں کی آنکھوں میں کھٹک رہی ہے۔ تو صرف اس گھر کی ہی بیٹی نہیں ہے، سارے گاؤں کی بیٹی ہے۔ اگر تو نے گاؤں کی عزت خاک میں ملا دی تو مجھے کوئی بھی معاف نہیں کرے گا۔

بینو : گاؤں کی عزت تو ہر روز خاک میں ملتی رہتی ہے۔ ہر پل، ہر گھڑی۔ یہ عزت جھوٹ اور دکھاوے کی بنیاد پر کھڑی ہے ــــ اس گاؤں کی ہر عورت کے دل میں آگ سلگ رہی ہے۔ اور بھڑکتی ہوئی اس آگ میں وہ راکھ ہوئی پڑی ہے ــــ اور تم بھی....

سنتی : گاؤں کی عزت کو خاک میں ملانے کے بجائے میں تو زہر کھا لوں ــــــ

بینو : سب جانتے ہیں گاؤں کی عزت کو۔ بوڑھی اور جوان عورتوں اور چھوٹی لڑکیوں کو معلوم ہوتا ہے کہ اندھیرے میں کیا کچھ ہوتا ہے۔ ہر کوئی دیکھتا ہے مگر مانتا نہیں۔ عورتوں میں ایک بات بہت ہی مشترک ہے۔ گہرے راز کو چھپانے کی کوئی سازش۔ تمہیں اسی بات کی بد دعا لگی ہے لیکن میں یہ بوجھ نہیں اٹھا سکتی۔

سنتی : گھر کی عزت کی خاک گلیوں میں نہ اڑا۔ گاؤں بہو کی بدنامی تو برداشت کر لیتا ہے مگر بیٹی کی بدنامی کو نہیں۔ بہو بیگانے گاؤں کی ہوتی ہے۔ پرایا خون لیکن بیٹی تو اپنا خون ہوتی ہے۔

بینو : میں مجبور ہوں ــــ مجھے ہول اٹھتا ہے۔ میں جا کر کہاں سانس لوں؟ کہاں جا کر روؤں؟ کہاں جا کر اپنا یہ درد دباؤں؟

سنتی : یہ درد عورت کے ساتھ ہی جنم لیتا ہے۔ اس کی قسمت۔ اس کی ہونی۔

بینو : میرا دم گھٹ رہا ہے.... آنکھوں کے آگے اندھیرا ہے۔ کون میرے کلیجے پر چھریاں چلا رہا ہے۔ کچھ نہیں سوجھتا۔ جب میں تم سے کڑوی باتیں کہہ رہی تھی میں ہوش میں نہیں تھی۔ میں اس سے پھر نہیں ملوں گی۔

سنتی : مجھے تجھ پر اعتبار ہے ــــ
بینو : اس سے پھر نہیں ملوں گی۔ نہیں ملوں گی۔ کبھی نہیں ملوں گی۔
(پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے)
سنتی : میری لاڈلی بیٹی۔ آنکھیں پونچھ لے ــــ میری بچّی۔ میرے سینے سے لگ جا۔
(اسے چھاتی سے لگا لیتی ہے۔ پڑوسن آتی ہے)
پڑوسن : کاکو کہاں ہے؟
سنتی : کیوں؟
پڑوسن : تمہاری بچھڑی باڑے میں اچھل کود رہی ہے۔ شاید وہ کوئی کیڑا یا کانٹا نگل گئی ہے۔ سلوتری کو بلاؤ۔
سنتی : بینو کا باپو اسی کے پاس گیا ہے اور ابھی تک نہیں لوٹا ــــ آتا ہی ہوگا۔ جا کر دیکھتی ہوں۔
پڑوسن : اجوائن اور السی لے جاؤ۔ نمک کا ڈلہ بھی۔
(سنتی تیزی سے جاتی ہے اور پڑوسن اس کے پیچھے پیچھے چلی جاتی ہے۔ بینو کھڑکی میں کھڑی ہو کر دور دیکھ رہی ہے۔ بچنی داخل ہوتی ہے۔)
بچنی : کیا کوئی گھر میں ہے۔ دالان تو خالی پڑا ہے۔ بھٹی جل رہی ہے۔ سنتی کہاں چلی گئی؟ میں نے چوکیدار کے ہاتھوں سندیسہ بھجوایا تھا۔ وہ کھڑی ہے کھڑکی کے پاس۔ سنتی۔!
بینو : (مڑ کر) کون؟
بچنی : میں تیری ماں کی سہیلی ہوں۔ تیری موسی! کہاں گئی ہے سنتی؟
بینو : باڑے میں۔ ہماری بچھڑی کو اپھارہ ہو گیا ہے۔ شاید باہر سے کچھ کھا آئی ہے۔
بچنی : پانچ سال پہلے۔ میں تمہارے گھر آئی تھی۔ کیا تو موسی کو بھول گئی ــــ؟
بینو : ہاں ــــ پچھلی بار تم میرے لیے بیر لائی تھیں۔
بچنی : اب بھی لائی ہوں ــــ مجھے یوں لگا جیسے تو اب بھی اتنی ہی بڑی ہے۔ دن گزرتے کیا دیر لگتی ہے ــــ اب تو تو جوان ہو گئی ہے۔
بینو : لو۔ میری ماں آگئی۔
(سنتی آتی ہے)

سنتی : زہے قسمت کہ تو آئی (دونوں بغلگیر ہو جاتی ہیں) تجھ سے مل کر کلیجے میں ٹھنڈک پڑ گئی۔ تو ویسی کی ویسی ہے۔ جوان اور ہنس مکھ۔ آ، پیڑھے پر بیٹھ جا ــــ مجھے تیرا سندیسہ مل گیا تھا مگر ہماری بچھڑی کو اپھارہ ہو گیا ہے ــــ ہم نے سوچا کہیں سانپ وغیرہ نہ کھا آئی ہو۔ لیکن بوڑھے سلوتری نے بتایا کہ بچھڑی گربھ وتی ہو گئی ہے۔ شکر ہے۔

بچنی : مجھے "ماہولی" بھیجو گی؟

سنتی : لو۔ تجھے نہیں بھیجوں گی تو پھر کس کو بھیجوں گی۔ تو کب آئی ؟

بچنی : کل دن ڈھلے۔ میرے شوہر یہاں تبدیل ہو گئے ہیں۔ پہلے ضلع دار کو برطرف کر دیا گیا وہ رشوت لیتا تھا۔

سنتی : اچھا ہوا تو یہاں آ گئی۔

بچنی : بنیو اور دیپے کے لیے بیر لے آئی ہوں۔

سنتی : اری بنیو۔ تو کیا کر رہی ہے۔ کہاں چلی گئی ــــ اپنی موسی سے بیر لے لے۔ لے پکڑ۔ تو اور دیپا آپس میں بانٹ کر کھا لو۔

(بنیو بیر دوپٹے کے پلو میں ڈالتی ہے اور اندر چلی جاتی ہے۔)

بچنی : جب میں آئی تو بنیو کھڑکی میں شام کے جھٹ پٹے میں کھڑی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے تو کھڑی ہے ــــ وہی قد۔ وہی صورت ــــ وہی جسم ــــ وہی آواز ــــ عین تیری طرح ــــ

سنتی : اب وہ بڑی ہو گئی ہے ــــ

بچنی : عین تیری طرح جب تو سترہ برس کی تھی۔

سنتی : شاید تو ٹھیک کہہ رہی ہے کل میری جوتی بن کر آئی۔ بنیو نے پہنی تو اس کے پاؤں میں آ گئی۔ اب میرا اور بنیو کا ایک ہی ناپ ہے۔

بچنی : اسے دیکھ کر مجھے وہ وقت یاد آ گیا جب تو اور میں جوہڑ پر کپڑے دھونے جایا کرتی تھیں۔ ہم پانی میں ٹانگیں لٹکا کر بیٹھتیں اور ایڑیاں صاف کرتیں ــــ

سنتی : جوہڑ کا پانی شفاف تھا لیکن اب گدلا ہو چکا ہے۔ آج کی لڑکیاں بھی ایسی ہی ہیں۔ پچھلے دنوں بنیو اپنے باپو کے سامنے بول پڑی اور اسے للکارنے لگی۔

بچنی : کیوں ؟
سنتی : کیا بتاؤں۔ وہ چوری چھپے صوبیدار کے بیٹے سے ملتی تھی ۔ مجھے دھڑکا لگا رہا کہ نہ جانے کیا کر بیٹھے۔
بچنی : تو اپنے دن بھول گئی ــ یاد ہے۔ تو گجن سے جوہڑ پر ملا کرتی تھی اور میں تیرے ساتھ جایا کرتی تھی۔
سنتی : جوانی کی مستی ــ حماقت ــ لیکن شادی کے بعد میں جوہڑ کی طرف کبھی نہیں گئی ــ یہ بات وہیں ختم ہو گئی۔
بچنی : کیا اُس سے اب بھی ملا کرتی ہو ؟
سنتی : کیا کہوں ــ کام ہو تو ادھر آ جاتا ہے۔ میں اس کی کوئی پروا نہیں کرتی۔
بچنی : کیا کاکو کو کبھی اس بات کا شک ہوا ؟
سنتی : پہلے پہل اس کے دل پر ایک پرچھائیں سی تھی، اس کے دل میں کوئی چیز کھٹکتی تھی۔ ــ اور ایک رات وہ مجھ پر برس پڑا ــ میں نے اس سے کہہ دیا کہ یہ سب کچھ جھوٹ ہے اور میں اس کے پاؤں پکڑ کر رونے لگی۔ اس کا دل پگھل گیا ــ اس کے بعد اس نے کبھی مجھ سے کچھ نہ پوچھا۔ اب گجن دوسرے لوگوں کی طرح کام کی غرض سے بھٹی پر آتا ہے۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔
بچنی : اصل بات تو تُو ہی جانتی ہے۔ آدمی کو سچا ہونا چاہیے۔ پھر کسی کا کوئی ڈر نہیں۔
سنتی : میرے میکے کی تُو ہی ایک میری سہیلی ہے۔ تجھ سے کچھ چھپا ہوا نہیں ہے۔ میرے دل میں اپنے شوہر کے سوا کوئی اور نہیں۔

(بنیو اور دیپا لڑتے ہوئے اندر سے آتے ہیں۔)

بنیو : میں کیوں دوں ؟
دیپا : دو گی کیسے نہیں ؟
بنیو : ہٹ دور ہو۔ اوپر چڑھا آ رہا ہے۔
دیپا : میرا حصّہ مجھے دو۔
سنتی : ارے۔ کیوں لڑتے ہو،
دیپا : مجھے تھوڑے بیر دیے ہیں۔

بینو : اپنے حصّے کی کھا کر میرے بیروں پر جھپٹ رہا ہے۔
سنتی : بینو۔ کیا تو چھوٹی ہے — بیروں کے لیے جھگڑ رہی ہے۔
بینو : لے اٹھا۔ سب کے سب۔

(وہ دوپٹے کے پلو کے سارے بیر پھینک دیتی ہے۔) دیپا
بکھرے ہوئے بیر چننے لگتا ہے۔
پتہ نہیں۔ مجھے کیوں غصّہ آ گیا۔

بچنی : میں چلوں — پھر کسی دن آؤں گی۔
سنتی : ضرور آنا —

(بچنی جاتی ہے۔)

سنتی : چولھے پر ساگ رکھ کر بھول گئی۔ باتوں میں لگی رہی۔ کہیں جل نہ گیا ہو۔ بینو۔ جا اور ساگ میں کڑچھی مار اور آٹا گوندھ — تیرا باپو آنے والا ہے۔ آج اس نے اپنے دوستوں کی دعوت کر رکھی ہے۔

(بینو اندر جاتی ہے۔ دیپا بیر چن کر اس کے پیچھے جاتا ہے۔)
(سنتی بینو کو جاتا ہوا دیکھتی ہے اور سوچ میں ڈوب جاتی ہے۔
گجن دروازے میں دکھائی دیتا ہے)

سنتی : کون ؟
گجن : میں ہوں — گلی میں سے گزرتے ہوئے میں نے تمہیں دیکھا۔
سنتی : اُس وقت آنا جب بینو کا باپو گھر میں ہو —
گجن : ناراض ہو —
سنتی : تم جانتے ہو۔ اس بات کو بیتے ہوئے کتنے برس ہو چکے ہیں۔ ابھی تک وہ داغ دھوئے نہیں جا سکے ہیں۔
گجن : تجھ سے اکیلے میں کم ہی ملا ہوں —
سنتی : میری بیٹی اندر کام کر رہی ہے اور میرا شوہر آنے والا ہے۔
گجن : میں تم سے ان دونوں کی چھاؤں میں ملا ہوں —
سنتی : کئی بار کہا ہے کہ تم کسی اور گاؤں میں جا کر آباد ہو جاؤ۔

گجن : جاٹ اپنا گاؤں اس وقت چھوڑتا ہے جب وہ سادھو بن جائے یا کسی عورت کے ساتھ بھاگ جائے۔ ایک بار ایسا موقع آیا تھا کہ میں گاؤں چھوڑ کر چلا جاتا۔ یاد ہے تم نے دن ڈھلے جوہڑ پر آنے کا وعدہ کیا تھا۔ تمہارا انتظار کیا تم نہ آئیں۔

سنتی : وہ بات نہ چھیڑو۔ میری منگنی ہو چکی تھی اور میری شادی ہونے والی تھی میں تمہارے پاس نہیں آسکتی تھی ــــ ایسا کام بدچلن عورت کیا کرتی ہے۔

گجن : میں نہیں جانتا کہ کون سی چیز بُری ہوتی ہے۔ اس رات میں نے تمہارا انتظار کیا تاروں کے جھنڈ ماند پڑ گئے۔ سرکنڈے ہوا میں جھومتے رہے مگر تم نہ آئیں۔

سنتی : مرد کا کیا ہے۔ جب بھی موقع ملے عورت کو پھسلا لیتا ہے۔ کوئی نصیب جلی ہی ایسی باتوں میں آجاتی ہے ــــ مجھ سے دوبارہ ایسی بات نہ کرنا۔

گجن : میں کسی کام سے آیا تھا۔

سنتی : کس کام سے ؟

گجن : کچھ پوچھنے آیا تھا مگر تم نے بھلا دیا۔

سنتی : کیا دیکھتے نہیں ہو۔ اب میری بیٹی سیانی ہو گئی ہے اور . . . .

گجن : دیکھتا ہوں ــــ اور میں تمہارے بارے میں سوچتا ہوں ــــ ہمیشہ تمہارے ہی بارے میں۔ اسی لیے میں نے شادی نہ کی ــــ

سنتی : مجھے اس کے لیے قصور وار نہ ٹھہراؤ۔ پہلے میں اپنے باپ کے گھر بدنام ہوئی ــــ پھر یہاں ــــ تمہارے لیے۔ آج میری بیٹی نے بھی مجھے تمہارا طعنہ دیا۔ آئندہ سے تم یہاں نہ آیا کرو۔

گجن : تم وہ بیتی ہوئی گھڑی بھلا سکتی ہو مگر میں نہیں۔

سنتی : تم سے ہنس کر بات کی اور بدنامی مول لی۔ بنو کی شادی جلدی ہونے والی ہے اور دیا بھٹی کا کام سنبھالنے کے قابل ہو گیا ہے۔ پُرانی بات کو اب بھول جاؤ۔

گجن : ٹھیک کہہ رہی ہو۔ مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے۔ اس بھٹی کی راکھ میں انگارے ٹٹولنے نہیں آؤں گا ــــ

(چلا جاتا ہے۔ سنتی کچھ دیر تک سوچ میں ڈوبی ہوئی دور دیکھتی رہتی ہے)

سنتی : بینو !

بینو : (اندر سے) ہاں ــ ہاں !

سنتی : ادھر آ

(بینو آتی ہے)

یہ کیا لیے پھر رہی ہو۔

بینو : کل گائے نے رسّی توڑ دی تھی۔ اس کی مرمّت کر رہی تھی۔

سنتی : لا۔ دیکھوں ــــ

بینو : لو ــ گھس گھس کر کمزور ہو گئی ہے۔ مرمّت تو کر دی ہے ــ مگر دو دن بھی نہیں چلے گی۔

سنتی : آٹا گوندھ لیا ؟

بینو : ہاں ــــ

سنتی : تنور تپا دیا ؟

بینو : ہاں ــ دہک رہا ہے۔

سنتی : میں ابھی آ کر روٹیاں لگاتی ہوں ــــ

(کاکو آتا ہے۔ بینو اندر جاتی ہے)

کاکو : صبح کا گھر سے نکلا ہوا اب مشکل سے واپس آیا ہوں۔ کئی دوکانوں پر گیا۔ چیزوں کے بھاؤ آئے دن چڑھ رہے ہیں۔ سوچا ابھی سے بینو کے زیور اور اس کا جہیز بنا لوں۔ ــــ درزیوں اور سناروں کو پھر فرصت نہیں ملے گی۔

سنتی : تمہارے جانے کے بعد میں نے بینو کو بہت ڈانٹا۔ گھنٹہ بھر اسے سمجھاتی رہی۔ وہ روتی رہی اور پھر کہنے لگی ــــ "میں اس سے اب کبھی نہیں ملوں گی ــــ" تم کچھ نہ کہنا۔ ــــ اب وہ ٹھیک ہے۔

کاکو : ایسی منہ زور اولاد کا کوئی کیا کرے ــــ

سنتی : بیاہ کے بعد خود ہی عقل آ جائے گی۔

کاکو : مرغے کو دانہ ڈالا ــــ ؟

سنتی : وہ چوگے بغیر رہتا بھی ہے۔ اگر دانہ نہ ڈالوں تو چونچیں مارنے لگتا ہے۔ آنگن صاف کر رہی تھی۔ اسے ایک طرف ہٹایا تو اس نے زور سے چونچ مار دی۔

کاکو : اسے بند رکھا کر۔ جبھی اچھا لڑے گا۔ کیا پکایا ہے؟

سنتی : ساگ اور گوار کی پھلیاں ۔ مکھن کا موٹا بھرا پڑا ہے۔

(موچی اور کھٹیک آتے ہیں)

کاکو : وقت پر آئے ہو۔ آجاؤ۔ روٹی تیار ہے۔ لیکن پہلے حقّے کا دم لگا لو۔ حُقّہ صاف نہ ہو تو مزہ نہیں آتا۔

(وہ جوتے اتار کر کھجور کی چٹائی پر بیٹھ جاتے ہیں اور حقہ پیتے ہیں)

موچی : (کھانستا ہے) بہت کڑوا تمباکو ہے۔

کاکو : اصل شیرے کا ہے۔ میں نے گڑ کی پٹھ دے کر اسے مسلا تھا۔

کھٹیک: گھونٹ بھر کے دیکھتا ہوں ــــ (کھوں ــــ کھوں) واہ بھئی آنکھیں کھل گئیں۔ ایک بار میں نے ولایتی تمباکو پیا تھا۔ اس نے اسے بھی مات کر دیا۔

موچی : ولایتی تمباکو تو نری گھوڑوں کی لید ہوتی ہے۔ گھر کے تمباکو کی ریس ہی نہیں ہو سکتی۔

کاکو : اخبار اٹھائے پھر رہے ہو۔ ہے کوئی خبر؟

موچی : سب سے بڑی خبر تو یہ ہے کہ (پڑھتے ہوئے) ولایت میں ایک میم نے کتّے کی شادی پر دو لاکھ روپیہ صرف کر دیا۔

کھٹیک: دو لاکھ کس پر خرچ کر دیا؟ کتے کہاں برات لے کر جاتے ہیں۔

موچی : دیکھ ــ پڑھ لے۔ چھپی ہوئی ہے۔ اور یہ تصویر ہے ــــ کتّے اور میم کی۔

کھٹیک: پھر تو ہم سے کتا ہی اچھا ہوا ــــ ریشمی گدّوں پر سوتا ہو گا۔

موچی : آگے سُن ــــ ایک مرد آہستہ آہستہ عورت بن گیا ہے اور اس نے اپنے خانساماں سے شادی کرالی ہے ــــ

کھٹیک: ولایت میں سبھی باتیں الٹی ہوتی ہیں۔ لا، حقّہ اِدھر دے ــــ

موچی : یورپ میں جنگ چھڑ گئی ہے۔ اٹُن بموں نے سمندر میں آگ لگا دی۔

کاکو : سنا ہے کہ ہمارے ویدوں میں اٹن بم بنانے کا طریقہ درج تھا۔ انگریز ہمارے اصل وید چرا کر لے گئے۔ ہمارے کاشی کے برہمن تو چٹیا رکھنا اور تلک لگانا ہی جانتے ہیں۔

کھٹیک: جنگ تو کہیں نہ کہیں لگی رہے گی۔ یہ ربّی حکم ہے۔

موچی : نال اِدھر گھما دے۔

کاکو : جنگ تو ہماری بھٹی کی طرح ہے۔ جو اس میں سے گزر گیا فولاد ہو گیا۔ ہمارے لوگ تو ہر وقت "شانتی۔ شانتی۔ شانتی۔" پکارتے رہتے ہیں اس لیے ان کو کوئی پوچھتا نہیں۔

کھٹیک : مسالے کی بڑی خوشبو آ رہی ہے۔

کاکو : تیری بھاوج نے ساگ کو گھی سے چھونک دیا ہے۔ بینو کی ماں! روٹی لاؤ۔

(دیپا چھبیے میں روٹیاں اور تین کٹوریوں میں ساگ اور مکھن لاتا ہے۔ تینوں روٹی کھاتے ہیں۔)

کھٹیک : ساگ بڑا ذائقہ دار ہے۔ خالص گھی کے گھونٹ!

موچی : بھاوج کے ہاتھ کی بنی ہوئی روٹی کا کچھ اور ہی مزہ ہے!

کاکو : دیپے۔ ساگ اور لا۔

موچی : تم آج تحصیلدار کی عدالت گئے تھے۔ گھوڑوں کی نعلوں کا ٹھیکہ ملنا تھا۔ کیا بنا؟

کاکو : بولی بہت چڑھ کر ٹوٹی۔ مفت کی دوڑ دھوپ۔ نیچے سے اوپر تک سب نے رشوت لے رکھی تھی۔ سرکار کے یہاں اندھیر کھاتہ ہے۔

کھٹیک : جس نے اتنی رشوت دی ہے وہ بھی تو بیچ میں سے کچھ کمائے گا۔

کاکو : کچّے لوہے کے ٹیڑھے بھینگے نعل بنا کر ٹھیل دے گا۔ بس کاغذی کارروائی پوری ہونی چاہیے۔ میں تو یوں ہی وہاں گیا۔ مجھ سے اپنی بھٹی کا کام ہی ختم نہیں ہوتا۔ میرا باپ کہا کرتا تھا۔ "اپنے ٹھکانے پر چاہے چار پیسے کم آ جائیں وہی اچھے۔ اپنا ٹھیا ہونا چاہیے۔"

موچی : روٹی کا تو مزہ ہی آ گیا۔ لا۔۔۔ اب حقّہ تازہ کر لا ۔۔۔ اس میں اب دم نہیں رہا۔

(ہاتھ دھوتے ہیں۔ دیپا روٹی کھلا کر برتن اٹھا لے جاتا ہے کاکو حقّے میں تازہ تمباکو بھرتا ہے)

کاکو : بینو کی ماں!

سنتی : (اندر سے) کیا ہے؟

کاکو : آج دودھ میں شکر نہ گھول دینا۔ مصری ڈال کر دینا۔ یہ روز روز تو آنے سے رہے۔

(کاکو ٹوکرے تلے سے مرغے کو نکال کر اسے پچکارنے لگتا ہے)

آ میرے لاٹ — تجھے اپنے ہاتھ سے کھلاؤں۔ بس باجرہ اور مکئی کھاتا ہے خوش ہو کر اور سفید تل ....

کھٹیک: تل؟

کاکو: ہاں۔ بڑے چاؤ سے کھاتا ہے۔ ان ہی سے تو اس کا جسم مضبوط ہے۔ اکھاڑے میں کسی کو ٹکنے نہیں دیتا۔ پچھلی بار اس کے ہاتھ دیکھے تھے۔ اگردن تان کر ایسا ہلہ بولا کہ فتو تیلی کا مُرغا میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا۔

موچی: اس کی عمر کیا ہو گی۔

کاکو: اسوج شروع ہوتے ہی ڈھائی برس کا ہو جائے گا۔

کھٹیک: ابھی تو پٹھا ہی ہے۔

کاکو: اس کی خدمت کرتے ہیں۔ خوراک کھلاتے ہیں۔ اس کی کلغی دیکھو۔ لال سُرخ — اور اس کے ناخن .....

موچی: بڑے تیکھے ہیں۔

کاکو: تو مرغوں کی بات کر رہا ہے — یہ تو بلّے کو نہیں بخشتا —

کھٹیک: پچھلی بار گجن کا مرغا بھی خوب لڑا۔

کاکو: سوکھے ٹکڑے کھانے والا مرغا کیا لڑے گا۔

کھٹیک: یہ بات نہ کہو۔ لڑتا تو سینہ تان کر ہے۔ پچھلی بار تمہارے مرغے سے مقابلہ ہوا تھا تو پتہ نہیں چلتا تھا کہ کس کا مرغا جیتے گا۔

کاکو: پھر کون جیتا؟

کھٹیک: ایک کو تو جیتنا ہی تھا۔ مگر لڑا خوب۔

کاکو: دیکھنے میں ہی ہیکڑ ہے۔ دن بھر کوڑے کرکٹ کے ڈھیروں پر کھُلا پھرتا رہتا ہے میں تو ایسا مرغا کبھی نہ رکھوں — بینو کی ماں!

سنتی: (اندر سے) آتی ہوں۔

کاکو: دودھ کا کیا ہوا؟

سنتی: بینو گائے دوہنے گئی ہے۔ آنے ہی والی ہے۔

کاکو: گائے دن چھپنے سے پہلے دوہ لینی چاہیے تھی۔ دیپ ہے۔ جا، بینو کو بُلا لا۔

(دیپا باہر جاتا ہے۔
سنتی مُرغے کو اٹھا کر اندر چلی جاتی ہے)

موچی : تجھے معلوم ہے۔ عائشہ کے یہاں لڑکی پیدا ہوئی ہے۔

کاکو : عائشہ کے گھر لڑکی۔ وہ تو خود ابھی چھوٹی سی لڑکی ہے۔ ابھی کل کی بات ہے — جب میں کام کر رہا ہوتا تو میرے پاس چلی آتی اور گال پُھلا کر پھونکیں مارنے لگتی۔ جب میں قینچیاں تیز کرتا تو چنگاریاں اڑتی ہوئی دیکھ کر چیختے ہوئے ہنستی۔ اور پھر چنگاریوں کو جھولی میں بھرنے کی کوشش کرتی۔

کھڈیک : حد ہو گئی۔ عائشہ کی گود میں لڑکی! یہ لڑکیاں بہت تیزی سے بڑی ہوتی ہیں۔ دنوں میں جوان ہو جاتی ہیں اور پھر دنوں میں ہی شادی —

کاکو : شادی تو ہوتی ہی ہے۔ بنو کی شادی بھی اسوج میں کر دیں گے۔ لڑکا ڈھونڈ لیا ہے۔

موچی : اچھا۔

کاکو : میں تو بڑا سادہ بیاہ کروں گا — لیکن کھانا اچھا کھلاؤں گا۔ ابھی سے چار بکرے خرید لیے ہیں۔ کافی ہوں گے۔ بنو کی ماں کو بھی ریشمی سوٹ سلوا دیا ہے۔ بنو کے زیور اور کپڑے ابھی سے تیار کرانے لگے ہیں۔ نتھ اور چوڑیاں سونے کی۔ تم دونوں کو آج ہی سے دعوت دے رہا ہوں۔ بھولنا نہیں۔

(دیپا دوڑتا ہوا آتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں خالی پتیلا ہے۔)

دیپا : باپو۔ وہ باڑے میں نہیں ہے۔ بچھڑا سارا دودھ پی گیا اور یہ پتیلا گائے کے پیروں میں لڑھک رہا تھا۔

کاکو : ہیں۔ وہ باڑے میں نہیں ہے۔

دیپا : نہیں۔

کاکو : کہاں گئی؟

دیپا : پتہ نہیں۔

کاکو : ارے اس کی حرکتیں ....

سنتی : (دوڑ کر اندر آتی ہے) کہاں چلی گئی۔

کاکو : اس کی حرکتیں ... ہماری قسمت .... وہ اس کے ساتھ چلی گئی۔

(دروازے کی طرف لپکتا ہے اور گلی کی طرف منہ کر کے پکارتا ہے)

کاکو : بینو!

(پڑوسن آتی ہے)

پڑوسن : کیا ہوا ؟

کاکو : بینو —

پڑوسن : میں نے اسے باڑے میں دیکھا تھا۔ سرون بھی وہیں تھا۔ ناند کے پاس کھڑی اس سے باتیں کر رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے بچھڑا کھول دیا۔

کاکو : وہ چلی گئی —

سنتی : اندھیرا ہو چکا ہے۔ تم اس کے پیچھے جاؤ۔ وہ ابھی دور نہیں گئے ہوں گے۔

پڑوسن : ہمت کرو اور اس کے پیچھے جاؤ۔ اس حرامی نے تمہاری عزّت خاک میں ملا دی ہے۔ جا کر اُسے پکڑ لو۔ جاؤ۔

کاکو : آؤ چلیں۔

(موچی، کھیٹیک اور کاکو تیزی سے جاتے ہیں۔)

گلی میں آوازیں : کاکو کی بیٹی بھاگ گئی! صوبیدار کے سرون کے ساتھ! لاؤ، اُس بے حیا کو۔ ماں باپ کے سر میں خاک ڈال گئی۔ اس حرامی کے ٹکڑے کر دو۔ اس شیطان کی ٹانگیں توڑ دو۔

سنتی : (دروازے میں) بالوں سے گھسیٹ کے لانا اس چڑیل کو۔

پردہ

تیسرا ایکٹ

ایک سال بعد — تیسرا پہر —
بچنی اور سنتی باتوں میں مصروف ہیں۔

بچنی : تو اُن دنوں کو کیسے بھول گئی۔ لڑکیوں میں "گدا" رچانے میں سب سے آگے، پیپل پر چڑھنے میں سب سے تیز، جو ہڑ پر کپڑے دھوتی تو دھوپ بھی چمک اٹھتی۔

سنتی : وہ سنتی اور تھی، یہ سنتی اور ہے ——— عرصہ ہوا میں نے اپنے آپ کو بھٹی میں جھونک دیا۔ یوں لگتا ہے جیسے صدیاں بیت گئی ہوں۔

بچنی : تجھے کیا اب کبھی گجن یاد نہیں آتا ؟

سنتی : نہیں ———

بچنی : ڈرپوک ہے۔

سنتی : عورت کی نجات گھر میں ہی ہے۔ اس کا خاندان، اس کا شوہر اور اس کے بچے۔ دیپا اب تیرہ برس کا ہو گیا ہے۔ دو چار سال اور گزرے تو شادی کے قابل ہو جائے گا۔ اس کی بیوی گھر آئے گی تو چوکا چولھا سنبھال لے گی۔ مجھے اور کیا چاہیے۔ آدھی سے زیادہ بیت چکی ہے۔ باقی عمر بھی یوں ہی گزر جائے گی۔

بچنی : نہ جانے تو نے کیسے صبر کا گھونٹ پیے رکھا۔ ہر نامی بھی بھاگ گئی تھی۔ لوگوں نے چار دن شور مچایا اور پھر خود ہی خاموش ہو کر بیٹھ گئے ——— آدمی کس کس کی لاج رکھے۔ میں تو یہی جانتی ہوں کہ جو اپنی من چاہی بات کرتا ہے وہی سکھی رہتا ہے۔

سنتی : میں نے کبھی اس طرح نہیں سوچا ——— اور اب سوچنے کا فائدہ بھی کیا۔ سب کچھ ختم ہو گیا۔

بچنی : میری بات کا جواب دے۔

سنتی : کیا ؟

بچنی : گجن ———

سنتی : تو نے پھر اس کی بات چھیڑ دی۔
بچنی : بتاتی کیوں نہیں ہو۔ گجن کو آئے ہوئے کتنے دن ہوئے ہیں ؟
سنتی : تین مہینے — اُس نے پوچھا۔ بینو کا کچھ اتا پتہ چلا ؟ میں نے اُسے ڈانٹ دیا اور کہا — " چلا جا یہاں سے — اب نہ آیا کر۔ خبردار — " بھلا وہ کیوں بینو کے بارے میں پوچھے۔ اس کا کیا واسطہ۔ وہ میرے دل پر یہ گہری چوٹ کیوں لگا؟ بینو کی بات چھیڑ کر وہ بھولی بسری بدنامی یاد دلاتا ہے — میری شکست — میں اپنے دل میں جھانک کر دیکھتی ہوں تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں اُسے اس لیے دبا کر رکھتی تھی کہ میں نے اپنے آپ کو دبا رکھا تھا۔ میں خانہ دار عورت کی طرح رہی کسی خواہش کو نزدیک نہ پھٹکنے دیا۔ اپنی ہونی کے آگے سر جھکا دیا۔ اب عزّت اسی میں ہے کہ میں اسے دبا کر رکھوں۔

(دیپا باہر سے دوڑتا ہوا آتا ہے اور سنتی کے سینے سے لگ جاتا ہے)

دیپا : ماں —!
سنتی : کیا گلی میں سے کسی سے لڑ کر آیا ہے —؟
دیپا : یہ دیکھ ماں — ٹیکو میرے اخروٹ چھین رہا تھا۔ میں جیت گیا تو مجھے گالیاں دینے لگا۔ میں سارے اخروٹ اٹھا کر دوڑ آیا۔
سنتی : نا — بیٹا لڑا نہ کر۔
دیپا : اُس نے مجھے گالی کیوں دی ؟
سنتی : اس کی زبان گندی ہوئی تیرا کیا گیا۔ (سر چومتے ہوئے) میرا چاند۔ بڑا نیک ہے میرا بیٹا۔ تیرے باپ نے تجھ سے بڑی امیدیں لگا رکھی ہیں۔ چھی چھی۔ تیرے بالوں میں سے کیسی بُو آ رہی ہے — گندگی کے ڈھیروں پر کھیلتا رہا ہے ؟
دیپا : نہیں۔ کل رات دیر تک باپو کے پاس بیٹھا ہوا بھٹی میں پھونکیں مارتا رہا۔ وہ چون میرے سر میں پڑ گیا ہوگا۔
سنتی : اچھا۔ یوں کر.... ارے۔ اب کہاں جا رہا ہے —؟
دیپا : باہر کھیلنے —
سنتی : بہت کھیل لیا۔ اخروٹوں کو سنبھال کر رکھ دے اور بھٹی میں سے راکھ نکال۔

دیپا : نہیں —

سنتی : ضد نہ کر —

دیپا : نہیں۔

سنتی : اچھا بیٹا بن — تیرا باپو ابھی آجائے گا اور تجھے ڈھونڈے گا —

دیپا : رات بیٹھے بیٹھے میری پیٹھ دُکھنے لگی — پھونکیں مارتے ہوئے میری کلائی دکھنے لگی ۔ اب تو میں کھیلنے جاؤں گا —

سنتی : بھٹّی کی راکھ کون نکالے گا ۔

دیپا : میں بینو کا کام کیوں کروں ۔

سنتی : اب بینو کے کام اور کون کرے گا ۔ تو ہی کرے گا نا میرے راجہ بیٹا ۔

دیپا : میں کیوں کروں ۔ تم کرلینا ۔

سنتی : کہنا نہیں مانتا ۔

دیپا : نہیں ۔

سنتی : بیٹا کہنا مانا کرتے ہیں ۔

دیپا : اچھا ۔ یہ بتاؤ میری مٹھی میں کیا ہے ۔ طاق یا جفت !

سنتی : اگر میں نے بتا دیا تو کام کرے گا ؟

دیپا : ہاں ۔

سنتی : مجھے ٹٹولنے دے ۔

دیپا : یہ لے —

سنتی : جفت !

دیپا : نہیں بتا سکیں ۔ دیکھ طاق ہے ۔ اب میں چلتا ہوں —

(دیپا دوڑ جاتا ہے)

سنتی : جب دیپا میرے سینے سے لگا تو اس کے بالوں میں سے عجیب سی بو آئی ۔ یہ میرے سینے میں اترتی چلی گئی — جی متلانے لگا — عرصہ ہوا ..... جب میں نے اس گھر میں قدم رکھا تھا تو اس وقت بھی ایسی ہی بُو آئی تھی ۔ دھیرے دھیرے دھونکنی کے چمڑے کی کچّی بھڑاس اور دہکتے ہوئے لوہے کی بُو آنی بند ہوگئی — آج انہیں

سال بعد وہ بو ایک دم پھر میرے کلیجے میں لگی ـــــ

بچنی : یہ انیس برس پہلے کی سنتی ہے۔

سنتی : ہاں ـــ جوہڑ پر کپڑے دھونے والی سنتی میرے باطن میں سوتی رہی۔ اچانک آج دھوپ کی مہک اور پانی کی موج جاگ اٹھی۔ دیر تک میں اس وہم میں ڈوبی رہی کہ اگر میں نے کسی سے کچھ کہا تو نہ جانے کیا ہو جائے ـــ لیکن بینو چلی گئی ـــ گاؤں میں دو دن شور مچا رہا اور پھر کچھ بھی نہ ہوا۔ مجھے بہت خوف آتا تھا ـــ

بچنی : تجھے بینو یاد آتی ہے؟

سنتی : ہاں ـــ کبھی کبھی وہ میرے پیٹ میں لاتیں مارتی ہے۔

بچنی : پھر تو کیا کرتی ہے ـــ؟

سنتی : کچھ نہیں۔ میں ان کو برداشت کرنے کی عادی ہو گئی ہوں ـــ وہ میرے آخری سانس تک میرے اندر یوں ہی لاتیں مارتی رہے گی۔ وہ چلی گئی اک بوجھ سا اتر گیا۔ ایک قرضہ اتر گیا۔ میں نہیں جانتی کہ یہ کیا ہے ـــ میں باڑے میں گائے دوہنے جاتی ہوں تو مجھے اندھیرے میں بینو کی پرچھائیں لرزتی ہوئی نظر آتی ہے... مویشیوں کے گرم سانس میں اس کا سانس....

بچنی : بینو۔ تیری بیٹی تھی ـــ تیری کوکھ کی پکار تھی۔ تیری دبی ہوئی چیخ۔ تو انیس[19] برس تک سلگتی رہی۔ پچھتاتی رہی۔ اس نے وہ کچھ کیا جو تو نہ کر سکی۔

سنتی : پہلے مجھے بینو پر غصہ آیا تھا۔ جی چاہتا تھا اس کا گلا گھونٹ دوں لیکن اصل میں آرزو تھی اپنا گلا گھونٹ دینے کی۔ اب مجھے اس سے کوئی گلہ نہیں، کوئی افسوس نہیں۔ میرے دل میں اس کے لیے ممتا امڈ آئی ہے۔ ایک طرح کی نجات! مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں اس کے نزدیک ہو گئی ہوں ـــ رات کو مجھے پیپل کے تنے کے ٹوٹنے کی آواز آتی ہے اور میرے سینے میں سورج دہکنے لگتا ہے۔

بچنی : میں تیرے دکھ کو سمجھتی ہوں۔

سنتی : دن ڈھلے آنا ـــ ہم کنوئیں پر پانی بھرنے جائیں گے۔

بچنی : آؤں گی۔

سنتی : جب سے بینو گئی ہے کسی کام میں جی نہیں لگتا۔ گھر کا کام پرایا معلوم ہوتا ہے۔

پچھنی : میں دن ڈھلے آؤں گی تیار رہنا۔

(پچھنی جاتی ہے —

سنتی بھٹی میں سے راکھ نکال کر آگ جلاتی ہے۔

گجن پھاوڑا لیے ہوئے داخل ہوتا ہے۔)

گجن : میں نے دھواں اٹھتا ہوا دیکھا تو سوچا کاکو گھر میں ہے۔

سنتی : وہ لوہا اور کوئلہ لانے کے لیے منڈی گئے ہوئے ہیں۔

گجن : پانی کی نالی کھودتے ہوئے پھاوڑا ٹوٹ گیا اور اس کی دھار مڑ گئی ہے۔ میں پھاوڑا یہاں چھوڑ جاؤں —

سنتی : چھوڑ جاؤ —

گجن : اگر تیار ہو گیا تو صبح آ کر لے جاؤں گا۔

سنتی : ان سے کہہ دوں گی۔

(گجن جانے لگتا ہے)

جب بھی تم آتے ہو لوگ باتیں بناتے ہیں۔

گجن : یہ تمہارا وہم ہے — تمہیں تو پرچھائیاں بھی باتیں کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ بھٹی میں سے بدنامی کا دھواں اٹھتا ہوا نظر آتا ہے۔

سنتی : ہاں۔ بدنامی — جوہڑ پر ملاقات کی بدنامی ابھی تک ختم نہیں ہوئی۔

گجن : ان باتوں کو بیس برس بیت گئے۔ اس کے بعد میں تم سے اپنے دل کی بات کرنے کے لیے ترستا رہا۔ میں جتنا تمہاری طرف بڑھا تم اتنی ہی پیچھے ہٹتی گئیں۔ میرا دل کچھ اکھڑا اکھڑا سا رہتا۔ کھیت اجڑ گیا۔ گندم کی جگہ جھاڑ جھنکاڑ اُگ آیا۔ ہر چیز ویران — برباد۔ میں نے پھر ہمت کی اور کھیت کو سدھارا — بارش ہوئی۔ دھرتی پانی پی کر تسکر بن گئی۔ اب میں نے خوب ہل چلایا ہے اور نئے بیج ڈالے ہیں۔

سنتی : اس بار اچھی فصل ہو گی؟

گجن : ہاں — اچھی فصل کی امید ہے۔

سنتی : اس دن میں نے تجھ سے کرخت آواز میں باتیں کیں۔ دن بھر میرا دل ڈوبا ڈوبا سا رہا۔ پہلے تم جب اپنی چلم کے لیے کوئلہ لینے آتے تھے تو میں جانتی تھی کہ تم مجھ سے

ملنے کے لیے آتے تھے ـــــ میرے دل میں امنگ اٹھتی مگر اوپر سے میں تجھ سے روکھی پھیکی باتیں کرتی ـــ تم پیچھے ہٹ گئے۔ دہکتا ہوا کوئلہ جیسے بجھ جائے۔ دن سُونے معلوم ہونے لگے۔

گجن : اب بھی میں یہاں نہ آتا اگر مجھے معلوم ہوتا کہ وہ گھر پر نہیں ہے۔ تم نے ہی تو کہا تھا۔

سنتی : کیا تم کبھی نہیں پچھتائے کہ تم اکیلے رہ گئے ـــ ؟

گجن : نہیں۔ اب کھیت میں کام کرنے کا مزہ آتا ہے۔ میں شادی شدہ لوگوں کو دیکھتا ہوں۔ عورتیں اور مرد ساری عمر آپس میں چخ چخ کرتے رہتے ہیں۔ ان میں کوئی سانجھا پن نہیں۔ کوئی پیار نہیں۔ کوئی تپاک نہیں۔ پیار کی چنگاری کے بغیر شادی کا کیا فائدہ ـــــ

سنتی : ایک بار جب میری شادی ہو گئی تو تمہارے بارے میں سوچنا بھی میرے لیے پاپ تھا۔ اس پاپ نے مجھے خوب تپایا اور جلایا۔ بار بار یہ پاپ مجھے ڈستا۔ ایک سوال بن کر میرے سامنے کھڑا ہو جاتا۔ مجھے کوئی جواب نہ سوجھتا۔ بینو چلی گئی تو میرے دل کو سکون آ گیا۔ اس کے بعد مجھے کئی بار وہ شام یاد آئی جب تم جوہڑ کے قریب کھڑے ہوئے میرا انتظار کرتے رہے ـــــ

گجن : اور تم نہ آئیں۔

سنتی : میں ڈرتی تھی۔

گجن : میں تمہارے ساتھ دکھ سکھ بانٹنے کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ مل کر عمر گزارنے کے خواب ـــــ آخرکار میں نے یہ سوچنا چھوڑ دیا۔ اس میں دُکھ ہی دُکھ تھا ـــــ

سنتی : تم بہت بدل گئے ہو۔

گجن : سب کچھ بدل گیا ہے۔ گاؤں کے گھر، گلیاں، جوہڑ، پیپل۔ مگر ان کی روح نہیں بدلی ـــــ چیزیں باہر سے تبدیل ہو جاتی ہیں لیکن اندر سے وہی رہتی ہیں۔ اب بھی میں اکثر رات کو اپنے کھیت میں جاگتا رہتا ہوں۔ سائیں سائیں کرتی ہوئی رات کے اندھیرے میں میں تیری آہٹیں سنتا ہوں ـــ میں کچھ نہیں بھولا۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ کل کی باتیں ہوں ـــــ

سنتی : جب میں اُن دنوں کو یاد کرتی ہوں تو دل ڈوبنے لگتا ہے۔ کئی بار بھٹی کی راکھ نکالتے

ہوئے میں اپنے ہاتھوں کو دیکھتی ہوں اور پھر تمہارا خیال آتا ہے اور میرے ہاتھ جوہڑ کے پانی سے دھل جاتے ہیں اور میری زندگی میں اجالا چمکنے لگتا ہے۔

گجن : ایک بار تم نے کہا تھا کہ تم آؤ گی ـــــ

سنتی : اگر میں تمہارے کھیت پر آؤں تو.....

گجن : میرے سپنے سچے ہو جائیں۔ میرے کھیت کی فصلوں کی قسمت جاگ اٹھے۔

سنتی : کئی بار سوچتی ہوں . . . .

گجن : کیا ؟

سنتی : جب کبھی رات کو بوندا باندی ہونے لگتی ہے۔ بھٹی گیلی ہو جاتی ہے۔ باڑے میں گائے رجھانے لگتی ہے ـــ تو میں کانپ اٹھتی ہوں ـــ سوچتی ہوں ـــ میں نے کیوں وقت ہاتھ سے جانے دیا۔

گجن : میرے کھیت پر آؤ گی ؟ ایک بار تم نے کہا تھا.....

سنتی : ہاں ـــ جی ہی چاہتا ہے لیکن کیسے آؤں ـــ ؟

گجن : میں تمہارا انتظار کروں گا۔

(گجن چلا جاتا ہے ـــ
سنتی بھٹی کی آگ لہکاتی ہے ـــ
کاکو آتا ہے)

کاکو : یہ جوار کی بوری لایا ہوں ـــ نمبرداروں نے دی ہے۔ موٹی جوار ہے۔ چوزوں کے کام آئے گی۔

سنتی : ان کا چوگا بھی ختم تھا ـــ

کاکو : بھٹی تو دہک رہی ہے۔

سنتی : کوئلوں کو ذرا سا چھیڑا تو وہ لپکنے لگے۔

کاکو : اچھا کیا۔ میں منڈی سے لوہا اور کوئلہ اور لے آیا ہوں ـــ دیپا کہاں ہے ؟

سنتی : کھیلنے گیا ہے۔

کاکو : اس سے کہتیں کہ وہ یہاں بیٹھتا۔ لوہے کے سب ڈلے آج کوٹ کر سونا ہے۔ بادل چھائے ہوئے ہیں..... یہ پھاوڑا کون رکھ گیا ہے ؟

سنتی : گجن ــــ
کاکو : کیوں؟
سنتی : کہتا تھا کہ اس کا پھل ٹیڑھا ہو گیا ہے اُسے پیٹ کر ٹھیک کرنا ہے۔
کاکو : اس کا یہاں آنے کا کیا کام؟
سنتی : وہ تمہارے پاس آیا تھا۔
کاکو : وہ کسی نہ کسی بہانے یہاں چلا آتا ہے۔ آئے کیوں نا، جب تُو اسے شہ دیتی ہے۔
سنتی : اُسے کیا معلوم کہ تم گھر پہ ہو یا نہیں۔ ہر وقت فنک ــــ
کاکو : مجھ سے ملنے آیا تھا کہ تجھ سے باتیں کرنے ــــ
سنتی : مجھ سے اُسے کیا بات کرنی تھی۔ میں تو بھٹی سلگا رہی تھی ــ اس نے تمہارے بارے میں پوچھا اور پھاوڑا رکھ کر لوٹ گیا۔
کاکو : اس کا نام سنتے ہی میرے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ دیرینہ عداوت جاگ اٹھتی ہے۔
سنتی : یوں ہی نا ہر وقت ہوا کے گھوڑے پر سوار رہا کرو۔
کاکو : تیرے اسی چلن نے تو بینو کو خراب کیا۔
سنتی : بینو کی بات دوبارہ نہ چھیڑنا ــــ
کاکو : کیوں نہ چھیڑوں ــ بینو تیری بیٹی نہیں تھی؟
سنتی : میری تھی تو کیا تمہاری نہیں تھی؟
کاکو : اگر میری ہوتی تو بھاگتی نہیں۔
سنتی : تمہاری زبان چمڑے کی نہیں، لوہے کی ہے۔ چھینی کی طرح کاٹتی ہے۔
کاکو : عورتوں کو چھینی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر تو اسے چھوٹ نہ دیتی تو وہ کیوں بھاگتی۔ ــــ میرے منہ پر کالک مل گئی۔ اس گھر میں کبھی کوئی ایسی بات نہیں ہوئی تھی۔ عورتیں چوکے میں رہیں اور مرد اہرن پر ــــ اگر معلوم ہوتا کہ وہ ایسی بدذات نکلے گی تو میں اس کے پیدا ہوتے ہی اس کے حلق پر انگوٹھا رکھ دیتا۔
سنتی : جبھی تو وہ بھاگ گئی۔
کاکو : کیا میری وجہ سے؟

سنتی : اور کس وجہ سے ـــــ؟

کاکو : اس رات جب میں نے اس کا پیچھا کیا تو کھیتوں میں گر گیا۔ وہ سینہ تان کر کھڑی ہو گئی اور اس نے پتھر اٹھا کر مجھے للکارا ـــــ اندھیرے میں اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں وہ اسی غنڈے سے ملنے جا رہی تھی۔ غصّہ سے اس کے تیور بدل گئے اور اس کی صورت تجھ جیسی ہو گئی۔ یوں لگا جیسے تو اندھیرے میں مجھ پر پتھر اٹھا کر کھڑی ہے۔ میں وہیں رک گیا۔ اس کی آنکھوں میں انتقام کی آگ تھی۔ باپ سے بیٹی کا انتقام۔ اپنے خون سے دشمنی اور وہ اندھیرے میں گم ہو گئی۔ اور ایک گھوڑا ہنہنایا۔ ٹیلے پر پرن گھوڑا لیے ہوئے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے دوڑتے ہوئے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ وہ دونوں فرار ہو چکے تھے۔

سنتی : اب وہ کبھی واپس نہیں آئے گی ـــــ کبھی نہیں۔ سال بیت چکا ہے۔ اس کا کچھ اتا پتہ نہیں۔ اب یہ بات گاؤں میں کسی کو بھی یاد نہیں۔

کاکو : میرے خون میں وہ کانٹے کی طرح کھٹک رہی ہے۔

سنتی : لیکن میرے خون میں تو گھل گئی ہے۔

کاکو : زہر کی طرح !

سنتی : نہیں ـ اپنے خون کی طرح ـــــ

کاکو : جبھی تو تیرے خون میں اُبال ہے۔ جبھی تیری آنکھوں میں سرکشی ہے ـــــ تیری عقل کو کسی نے اوندھا دیا ہے۔

سنتی : تمہیں ہر بات اوندھی نظر آتی ہے۔ میں کیا کروں ـــــ ہر وقت جھلّاتے رہتے ہو۔ تمہارے دل پر غصّہ کی کالک پُتی ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمہیں کچھ دکھائی نہیں دیتا۔

کاکو : مجھے سب کچھ دکھائی دیتا ہے۔

سنتی : جلتے تپے لوہے کا چُون اُڑ اُڑ کر تیرے بدن میں رچ گیا ہے ـــــ دن رات لوہا کوٹتے کوٹتے تم خود لوہا ہو گئے ہو ـــــ ٹھنڈا ـــــ سنگدل ـ بےحس ـ انیس برس تک ہتھوڑے کی اندھا دھند چوٹوں نے میری روح کو چکنا چُور کر دیا ہے۔ پورے انیس برس ـــــ

کاکو : مجھے انگارے کیوں دہکاتی ہو۔

سنتی : کیوں نہ دہکاؤں ـــــ یہ انگارے کبھی نہیں بجھے تھے۔ ان کے نیچے ہمیشہ آگ دہکتی رہی۔

جب بنّو اس گھر میں تھی تو میرے اندر دو عورتیں تھیں۔ دونوں ایک دوسری کی دشمن۔ میرا اپنا لہو مجھے ڈستا تھا۔ بنّو میری سوت تھی — لیکن اب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ وہ میری کوکھ کی پکار تھی۔ وہ درست تھی اور میں غلط —— وہ میری تکمیل تھی۔ میری سوئی ہوئی قسمت کو جگانے کی ذمّہ دار —— میں نے اپنی بیٹی کے ذریعہ سے اپنی قسمت بھوگ لی۔ بنّو میرا ہی روپ تھی۔

کاکو : بدلہ لینے والا خون — بے حیا اولاد ——

سنتی : تم نے اسے ڈرا کر، دھمکا کر اور جکڑ کر رکھا۔ وہ یہ ظلم برداشت نہ کر سکی۔ وہ باغی ہو گئی۔ اس نے تمہیں للکارا اور تیری اکڑ فوں توڑ کر رکھ دی۔ تم اس کے گناہ کو کبھی معاف نہ کر سکے۔ اب تم مجھ سے اس کا بدلہ لے رہے ہو۔ ہاں، تمہاری یہ مراد کبھی پوری نہیں ہوگی۔ خبردار جو مجھ پر ہاتھ اُٹھایا۔

(پڑوسن آتی ہے)

پڑوسن : مجھے تھوڑا سا دودھ چاہیے۔

کاکو : کس لیے ؟

پڑوسن : میری بیٹی کے سسرال سے مہمان آگئے ہیں۔

کاکو : سنتی سے پوچھ لو۔

(دیپا دوڑا ہوا آتا ہے)

کاکو : کہاں گیا تھا تو ؟ ہر وقت گلی میں کوڑیاں اور اخروٹ کھیلتا رہتا ہے۔ یہاں بیٹھ اور کام کر۔ کام سیکھ لے ورنہ در بدر کی ٹھوکریں کھائے گا۔ سنسی پکڑ اور دھونکنی کے پاس بیٹھ جا۔

پڑوسن : دودھ کا کٹورا چاہیے تھا۔ ضرورت پڑ گئی۔ تیرا پڑوس چھوڑ کر کسی اور کے گھر کیا پوچھتی۔

سنتی : کٹورا یہاں رکھ جا — گائے دوہ کر دیپے کے ہاتھ بھجواتی ہوں۔

(پڑوسن جاتی ہے)

کاکو : اندھیرا ہونے سے پہلے روٹی پکا لے۔ چوماسہ شروع ہے۔ پتنگے گر گر کر روٹی میں پڑیں گے۔ تو نے ابھی تک گائے کا دودھ بھی نہیں دوہا۔ باڑے میں گائے

رچھا رہی ہے۔ جا پہلے دودھ دوہ لا — جلدی آنا ——

سنتی : دال چولھے پر رکھی ہوتی ہے۔ دیپے کڑچھی پھیر دینا۔ لگ نہ جائے۔ گائے کا دودھ دوہ کر ابھی آئی۔

(سنتی تپیلا اُٹھا کر جاتی ہے۔ اس کی چال میں تازگی اور اعتماد ہے۔ اس نے اس وقت وہ دوپٹہ سر پہ لے رکھا ہے جو بینو نے پہلے ایکٹ میں اوڑھ رکھا تھا۔ موچی اور کھٹیک آتے ہیں۔)

کاکو : آؤ بھئی۔ کام ختم کر آئے —؟

موچی : تیرے پاس حقہ پینے آئے ہیں۔

کاکو : وہ پڑا ہے۔ اسے تازہ کر لے۔ میں یہ ڈلہ کوٹ لوں ——

موچی : تمباکو کی پوٹلی کہاں ہے ؟

کاکو : کھونٹی سے لٹک رہی ہے۔ پانی بدل لینا اور نالی اچھی طرح صاف کر لینا۔ بھٹی میں کوئلے بہت ہیں۔

کھٹیک : دھرتی پانی پی پی کر سیراب پڑی ہے۔ بے پناہ اناج ہوگا اس بار۔ اور تو اور۔ ٹیلوں پر بھی باجرہ لہلہا رہا ہے۔

کاکو : بہت بارش ہوئی۔ تین دن بھٹی ٹھنڈی رہی۔ میں نے دوبارہ لیپی پوتی۔ کام جم گیا ہے۔ دیپے ذرا ہمت سے پھونکیں مار ——

دیپا : باپو — کھال پھٹی ہوئی ہے اور اس میں سے ہوا نکل رہی ہے۔

کاکو : کہاں سے ؟

دیپا : یہ دیکھو۔ چوہے کتر گئے ہیں۔

کاکو : اب کی بار نئی دھونکنی لوں گا۔ تیرے پاس کوئی کھال تیار ہے ؟

کھٹیک : کل چھ کھالیں صاف کی ہیں نمک لگا کر سوکھنے کے لیے ڈال دی ہیں۔ حقہ ذرا ادھر کر دو۔

دیپا : باپو۔ میں اس پھاوڑے کے پھل پہ دھار رکھ کر دکھاؤں ؟ بھٹی میں پڑا ہوا سرخ ہو رہا ہے۔

کاکو : میری جگہ پر آ کر بیٹھ اور اس پر دھار رکھ۔ میں دھونکنی پر بیٹھتا ہوں۔

(دونوں جگہ تبدیل کر لیتے ہیں۔)

یوں کام سیکھتے ہیں بائیں ہاتھ میں سنسی پکڑ اور دائیں ہاتھ سے ضرب لگا۔ ہاں

—— ایسے ہی۔

دیپا : میں تو ابھی اسے کوٹ پیٹ کر سیدھا کر دوں گا۔

موچی : ہر چیز مہنگی ہو گئی —— لوہا ہی سونے کے بھاؤ ہو گیا۔ پہلے جیسے کیل ہی نہیں ملتے۔

کاکو : پہلے کیا تھا —— ؟ صبح سے شام تک لوہا کوٹتے اور دو وقت کی روٹی نصیب نہ ہوتی لیکن اب

موچی : مگر اب چیزوں کے بھاؤ بھی تو چڑھتے جا رہے ہیں۔

کاکو : پیسہ پاس ہو تو پھر ہر چیز سستی ہے۔ پہلے اُجرت ہی کیا تھی۔ اب تو ٹھونک بجا کر پیسے لیتے ہیں۔

کھٹیک : میں اپنے بیٹے کو اسکول میں داخل نہیں کراؤں گا۔ پڑھائی میں کیا رکھا ہے۔ یوں ہی دماغ نکھو کھلا ہو جاتا ہے۔ نہ ادھر کا رہتا ہے نہ ادھر کا۔ ابھی سے اپنے ساتھ کام میں جُتا لیا ہے۔

کاکو : دیپا بھی دو چار سال میں پورا کاریگر بن جائے گا۔ ابے دیپے۔ جا اندر سے پتیلا لے آ۔ یہاں بھٹی پر چائے رکھ دے۔

(دیپا پتیلے میں پانی ڈال کر بھٹی کے اوپر رکھتا ہے۔ کاکو اہرن پر بیٹھ جاتا ہے۔)

کھٹیک : چائے تھوڑی پیا کر۔ چائے پی پی کر تیرا پیٹ اندر سے کالا ہو گیا ہو گا۔ اور تیرا مرغا کہاں ہے —— ؟

کاکو : ٹوکرے میں سویا پڑا ہے۔

موچی : بینو کا کچھ پتہ چلا ؟

کاکو : نہیں۔

موچی : عورت کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔

کاکو : ہم لوہے کو ڈھال کر اسے نرم کر لیتے ہیں۔ جیسے جی میں آئے موڑ لیتے ہیں لیکن

عورت کے دل کو کوئی نہیں ڈھال سکتا۔ خبر نہیں - یہ کس وقت کس طرف مڑ جائے۔ نہ جانے عورت کا دل کس لوہے کا بنا ہوا ہوتا ہے۔

دیپا : چائے ابل گئی بابو۔

کاکو : سب کے لیے گلاسوں میں ڈھال دے۔

(تینوں چائے پیتے ہیں۔)

کاکو : بٹیا - دیا جلادے — اندھیرا ہوتا جا رہا ہے۔

(پڑوسن آتی ہے)

پڑوسن: پورب کی طرف بادل امڈے چلے آرہے ہیں، کالے بادل۔

ٹھیک: بوندیں پڑنے لگی ہیں۔ میں کھالیں باہر ڈال کر آیا تھا۔ بھیگ نہ جائیں۔

(ٹھیک اور موچی چلے جاتے ہیں۔)

کاکو : تم ہانپتی ہوئی کہاں سے آرہی ہو —؟

پڑوسن : باہر سے چارہ لے کر آئی ہوں — بچھڑا بھوکا تھا۔ میرے لوٹے میں دودھ ڈال دیا؟

کاکو : ابھی تو ستی گائے دوہ کر لوٹی نہیں۔ اُسے گئے ہوئے کتنی ہی دیر ہو گئی ہے۔ تم جاتے ہوئے اُسے بھیج دینا۔

پڑوسن: کہاں سے؟

کاکو : باڑے میں سے۔

پڑوسن: وہ باڑے میں نہیں ہے۔

کاکو : وہ وہیں تو دودھ دوہنے گئی ہے —!

پڑوسن: میں نے اسے پیپل کے پیڑوں والے جوہڑ کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا۔

کاکو : کیا —؟

پڑوسن : وہ تیز تیز قدم اٹھاتی جارہی تھی۔ میرے سر پہ چارے کی گٹھڑی تھی۔ میں نے اسے جاتے ہوئے دیکھا تو وہ باجرے کے کھیت کے پاس جاکر غائب ہو گئی۔

کاکو : جھوٹ — وہ باڑے میں دودھ دوہنے گئی ہے۔

دیپا : ماں کہتی تھی کہ وہ گائے کا دودھ دوہنے جارہی ہے۔" اب تک میں بینو کے کام کرتی رہی اور آج میں بینو کا کام پورا کرنے کے لیے جارہی ہوں۔"

کاکو : بینو کا کام؟ میں جا کر اُسے لاتا ہوں ـــــ
دیپا : باپو۔ بھٹی میں لوہا تیار گیا۔
کاکو : جاتا ہوں اور اسے لاتا ہوں۔

(باہر چلا جاتا ہے)

دیپا : جب میں بڑا ہو جاؤں گا تو میں بڑے بڑے کڑے بنایا کروں گا۔ ایک بار میں نے بازیگر کا تماشہ دیکھا۔ ایک بہت بڑے کڑے میں چھریاں اور چاقو جڑے ہوئے تھے اور بازیگر کا بیٹا اس میں سے بھی چھلانگ لگا کر گزر گیا۔
پڑوسن : تو بھی اپنے باپ جیسا کاریگر بنے گا۔ تیرا جنم میرے ہاتھوں ہوا۔ تجھے میں نے ہی "گڑتی" دی تھی۔ اس گاؤں کے لوگ ہل چلاتے اور لوہا کوٹتے رہیں گے۔ عورتوں کے سینے میں آگ دہکے گی اور وہ اسی آگ میں جلیں گی۔

(کاکو آتا ہے)

کاکو : وہ باڑے میں نہیں تھی اور گجن بھی اپنے گھر پر نہیں۔
پڑوسن : وہ چلی گئی۔

(جاتی ہے)

دیپا : باپو چولھے کی آگ بجھ گئی۔
کاکو : وہ ہمیشہ کے لیے گجن کے ساتھ چلی گئی۔ اور اوپر سے رات ہو گئی ہے۔ وہ بینو کے کام پورے کرنے گئی ہے۔ (چیختے ہوئے) بینو ـــ بے حیا ـــ بے شرم۔ گناہگار۔ میں اس کے پیچھے نہیں جاؤں گا۔ دیپے دروازہ بھیڑ دے اور کنڈی لگا دے ـــ
دیپا : کنڈی سخت ہے۔ لگتی نہیں۔
کاکو : لاؤ۔ میں لگاؤں ـــــ

(کنڈی لگاتا ہے)

دیپا : باپو۔ اہرن پر پڑا ہوا لوہا ٹھنڈا ہو گیا۔
کاکو : اسے میں کوٹتا ہوں ـــ ٹھنڈا ہو گیا ہے لوہا۔۔۔ کوٹا نہیں جاتا۔

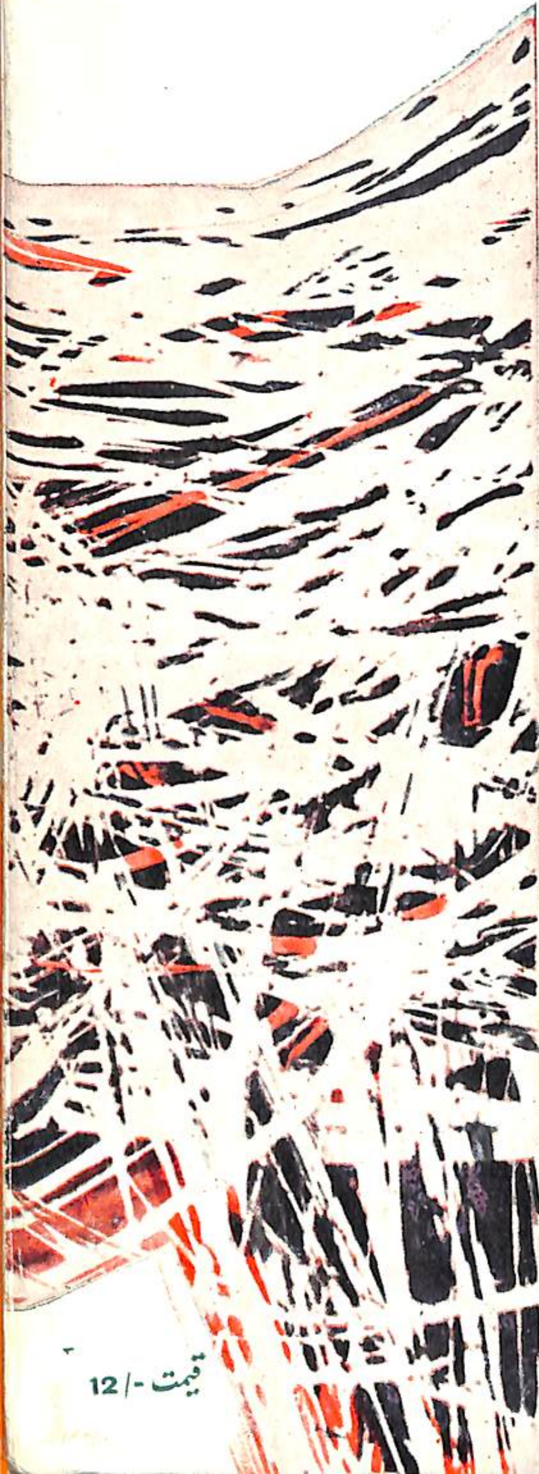
(دروازے پر دستک)

کاکو : کون؟

آواز : میں ہوں ——
کاکو : گجن
آواز : نہیں ۔ تیرا دوست ۔ موچی ۔
کاکو : نہیں ، نہیں ۔ مجھے لوہا کوٹنا ہے ۔ کام کرنا ہے ۔
موچی : کنڈی کھولو ——
کاکو : تم جاؤ ۔ میں کام میں مصروف ہوں ۔ مجھے باتیں نہیں کرنی ہیں ۔ جاؤ ۔ دیپے تو میرے پاس آ کر بیٹھ ۔

(دیپا دھونکنی چلاتا ہے ۔ اور کاکو اندھیرے میں سرخ لوہا کوٹتا ہے ۔)

پردہ



زیرِ نظر کتاب میں تین مشہور و معروف پنجابی ناٹک کاروں کے تین اہم ناٹک شامل کیے گئے ہیں۔ بلونت گارگی کا ناٹک "لوہار" (لوہا کُٹ) زندگی کے مخالفانہ جذبوں کے ساتھ مکمّل انصاف کرتے ہوئے قاری کو حقیقت سے بھی آگے اشاریاتی دُنیا تک پہنچا دیتا ہے۔ اس ناٹک کا مرکزی خیال خاندان اور محبّت کا آپسی تناؤ ہے اور حقیقت سے اشاریت تک کا سفر گارگی کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔

کرتار سنگھ دُگل کا ناٹک "پُرانی بوتلیں" زندگی کی سوکھی نثر میں شعری دھارا کی طرح بہتا ہے۔ پیار محبت کے شادی سے پہلے والے تعلق کو اس ناٹک میں غیر روایتی انداز میں پیش کیا گیا ہے اور یہ یقیناً دگل کی فن ڈراما پر ماہرانہ چابکدستی کا ثبوت ہے۔

سنت سنگھ سیکھوں کا ناٹک "دمینتی" قدیم جمالیاتی ناٹک اور "دِکش پلے" کا مجموعہ ہے۔ سیکھوں نے نل دمینتی کی پُرانی کہانی کو نئے نئے حوالے دے کر اس کی نئی تخلیق کی ہے اور اپنی فنکاری سے اسے ایک نیا روپ بخش دیا ہے۔

نیشنل بُک ٹرسٹ، انڈیا

قیمت -/12